رضا علی عابدی

ملکہ وکٹوریا اور مُنشی عبدالکریم



ملکہ وکٹوریا

اور

مُنشی عبدالکریم

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.03 Raza Ali Abdi
Malika Victoria aur Munshi Abdul Karim/ Raza Ali Abdi.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2004.
128pp., With Photos
1. Indian History (British Period).
I. Title.

2004
نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1596-X

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

اپنے نوعمری کے عزیز دوستوں

غازی، مظہر، جمیل، رشید

انیس، عالم، امیر نواب

ثناء اللہ اور شریف کمال عثمانی

کے نام

جب ملکہ وکٹوریا کی نواسی، مارگریٹ کی منگنی ہوئی اور وہ اپنی سسرال جانے کی تیاری کرنے لگی تو ملکہ بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے مارگریٹ سے کہا کہ تم اپنی بیوہ ماں کو چھوڑ کر جا رہی ہو، یہ اچھی بات نہیں۔ اس پر نواسی نے کہا۔ "میں مسلمانوں کے رویے سے متفق ہوں کہ والدین سب سے مقدم ہیں، لیکن یورپ میں تو مذہب کی تعلیم دیتے ہوئے یہ بات نہیں سکھائی جاتی۔"

منشی پانچ برس سے ملکہ کے پہلو سے لگے یوں ہی تو نہیں کھڑے تھے۔

ایک اقتباس

کون سا باب کہاں کھلتا ہے

تحقیق کا معاملہ

تحقیق کا معاملہ بھی خوب ہے۔

نیک نیتی سے کی جائے تو اُدھر نہیں جاتی جدھر آپ اسے لے جانا چاہتے ہیں، بلکہ آپ کو اُس طرف لے جاتی ہے جدھر کبھی آپ کا دھیان بھی نہیں گیا ہوگا۔

اس کتاب کی خاطر میں نے بھی تحقیق کی۔ میرا خیال تھا کہ تحقیق کی انگلی تھامے تھامے منشی عبدالکریم کے کوچے میں نکلوں گا، لیکن مجھے بتائے بغیر اس نے مجھے ملکہ وکٹوریا کے دربار میں لے جا کھڑا کیا۔

میں تو یہ طے کر کے چلا تھا کہ منشی کی زندگی لکھوں گا اور ملکہ کہیں پس منظر میں رہیں گی۔

لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔

میں نے چاہا تھا کہ منشی عبدالکریم کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردے اٹھاؤں گا، لیکن ذرا گہرائی میں گیا تو پتہ چلا کہ اس سے کہیں زیادہ دبیز پردے ملکہ وکٹوریا کی شخصیت پر پڑے ہوئے ہیں۔

ان کی ہستی کے ہزار پہلو تھے۔ کچھ ہم نے دیکھے، کچھ ہمیں دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

وہ پہلو دکھا دیے گئے ہوتے تو شاید کراچی کے فرئر ہال کے باغ میں آراستہ ملکہ وکٹوریا کا سنگِ مرمر کا شان دار مجسمہ اکھاڑ کر بلدیہ کراچی کے کاٹھ گودام میں نہ پھینکا جاتا اور شاید وکٹوریا اسٹریٹ کا نام وکٹوریا اسٹریٹ ہی رہتا۔

انہیں پیار سے ملکہ ٹوریا کہا جاتا تھا تو یوں ہی تو نہیں۔ تانبے کے جن سکّوں پر ان کی شبیہ ہوتی تھی، مائیں انہیں کالی ڈوری میں پرو کر بچوں کے گلے میں ڈالتی تھیں تو بلا سبب تو نہیں۔

یہ سارے سبب اور یہ سارے جواز، جہاں تک میری رسائی تھی میں نے ان صفحات میں یک جا کر دیے ہیں۔

اردو میں ایک زمانہ تھا جب تاریخی ناول کثرت سے لکھے جاتے تھے۔ لیکن جب محلے محلے چلنے والی

لائبریریاں بند ہوئیں تو کتاب اور کتب بینی، دونوں ادھ موئے ہو کر رہ گئے۔ وہ ناول لکھنے کا سلسلہ بند ہوا اور اس کے ساتھ کتاب پڑھنے کی عادت بھی رخصت ہوئی۔ مغرب میں تاریخی ناول یا فکشن لکھنے کا چلن ہمیشہ تھا لیکن ان لوگوں نے ایک کام اور کیا، انہوں نے تحقیقی تاریخ کو عوام کے لئے لکھنا شروع کیا اور اسے پاپولر ہسٹری کا نام دیا۔

ہمارے ہاں اس کی بنا پڑی بھی تو یوں کہ حکومتوں اور فوجوں سے سبک دوش ہونے والوں نے کتابیں لکھ کر اپنی دانست میں درونِ خانہ امور پر پڑے ہوئے پردے اٹھانے شروع کئے۔ محمد حسین آزاد کے دربارِ اکبری کے بعد قبولِ عام حاصل کرنے والی تاریخ پھر بس چند ایک ہی نے لکھی۔

'ملکہ وکٹوریا اور منشی عبدالکریم' تمام کی تمام مستند حوالوں سے لکھی گئی ہے۔ اس میں فکشن کہیں نہیں۔ کہیں کہیں قیاس سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن تحقیق کا ایک لطف یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات کھل کر بات نہیں کہتی، صرف اشارے کرتی چلتی ہے۔ ایسے میں محقق جو قیاس کرتا ہے اس کا جواز خوب خوب موجود ہوتا ہے لیکن اشاروں کنایوں میں۔

جب سرسید نے کہا کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس اقلیتوں کی نمائندگی نہیں کر سکتی اور جب اس خیال کے پیشِ نظر برطانیہ میں رفیع الدین احمد نے منشی عبدالکریم کے اشتراک سے مسلم پیٹریاٹک لیگ کی بنیاد ڈالی تو یہ بات کہیں نہیں لکھی ہے کہ اس میں نہ صرف ملکہ وکٹوریا کا مشورہ شامل تھا بلکہ ان کی درپردہ حمایت اور سرپرستی بھی حاصل تھی۔

لیکن تحقیق اس امر کی صاف دلالت کرتی ہے۔

اہلِ ہند اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کے بارے میں وکٹوریا، قیصرِ ہند کے جذبات اور احساسات ایک پوری کتاب کے متقاضی تھے۔

مجھے کیا خبر تھی کہ یہ حق ادا کرنے کے سعادت میرے حصے میں آئے گی۔

بظاہر اس تحریر میں محلاتی سازشوں اور رنگ و نسل کے تعصبات کے اشارے ملیں گے، لیکن ان کی پردہ کشائی میرے منصوبے کا حصہ نہ تھی۔ انیسویں صدی کے دربارِ انگلستان میں جو انداز فکر تھا وہ اب اپنے وقت سے کاٹ کر دیکھا جائے تو عجب سا لگتا ہے۔ لیکن تاریخ کے ساتھ دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دور کی صورت حال کو اسی دور کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، آج کی کسوٹی پر نہ پرکھنا چاہیے۔ ہر زمانے کی فکر جدا ہوتی ہے اور ہر مقام اور علاقے کے نظریے مختلف۔

ہاں جو تبصرے ہاتھ کے ہاتھ ہو جائیں وہ پھر ایک صدی بعد بھی اپنی صداقت کے معاملے میں قدیم نہیں ہوتے۔ دربارِ برطانیہ میں ملکہ کے ایک ہندوستانی منظورِ نظر کا جو حال کیا گیا، وہ ایک طرف، لیکن ملکہ کی وفات کے

صرف چھ ماہ بعد لیڈی کرزن جیسی دانش مند خاتون کا یہ کہنا کہ وہ سب ایک مضحکہ خیز ڈھکوسلا farce تھا، بہت معنی رکھتا ہے۔

دربار میں ایک شخص ایسا تھا جسے منشی عبدالکریم ایک آنکھ نہ بھائے اور وہ تھے ملکہ کے ذاتی معالج، سر جیمز ریڈ Reid۔ ان کی سوانح ان کے بیٹے کی اہلیہ مکیلا ریڈ Michaela Reid نے لکھی ہے جس کا نام Ask Sir James ہے۔ اس کتاب میں حافظ عبدالکریم کے بارے میں پورا ایک باب ہے جس کو 'منشی کا خبط یا منشی کا جنون' کا عنوان دیا گیا ہے۔

اس باب میں پورا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ منشی عبدالکریم جعل ساز تھے اور ملکہ کو دھوکا دے کر اپنا الو سیدھا کر رہے تھے۔ مصنفہ نے بڑی مشکل سے اعتراف کیا ہے کہ اس میں کچھ ڈاکٹر کی اکڑی ہوئی گردن اور کچھ نسلی تعصب کو بھی دخل تھا۔ جو قارئین مزید مطالعے کے مشتاق ہوں وہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ خود میں نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے کیونکہ منشی کے بارے میں اتنی تفصیل اور کہیں نہیں ملتی۔

دوسری کارآمد کتاب Carolly Erickson کی نہایت دلچسپ تصنیف Her Little Majesty ہے۔ اس دور کی وہ سرکردہ سوانح نگاروں میں شامل ہوتی ہیں۔ وکٹوریا کی اس سے بہتر سوانح شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔ میں نے ان کی تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔

تیسری دل چسپ کتاب Elizabeth Lanfgord کی تصنیف Victoria R.I ہے۔ یہ اگرچہ ضخیم اور طولانی ہے لیکن اس کے بعض حصے بہت دل چسپ ہیں۔

چوتھی کتاب، جس سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا، سوشیلا آنند کی Indian Sahib ہے۔ انہوں نے اصل حوالوں تک جا کر تحقیق کی ہے اور بہت سے تاریک گوشوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے رویے میں برصغیر کا انداز فکر شامل ہے جس نے ان کے تبصرے کو دل چسپ بنا دیا ہے۔

ایک اور کتاب، جو ملکہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہے وہ ہے Queen Victoria's Sketchbook۔ اس کے علاوہ Lady Lytton's Court Diary اور Lady Curzon's India ہمارے اس مطالعے کو تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔

رفیع الدین احمد کو تو تحریک آزادی کے بیشتر مورخوں نے ایسا بھلایا ہے جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ البتہ اس سلسلے میں رفیق زکریا کی کتاب Rise of Muslims in Indian Politics بے مثال ہے۔

یہ تمام کتابیں میرے پیش نظر رہی ہیں اور میں ان کے مصنفوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

آخر میں میرے شکریہ کے مستحق منشی حافظ عبدالکریم کے پوتے خورشید خاں عرف رئیس میاں ہیں، اس تحریر کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس کے قریب تھی۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب تشنہ رہ جاتی۔ اسی لئے میں اپنی یہ کاوش رئیس میاں کے نام کرتا ہوں۔

منشی عبدالکریم کی شخصیت اور سوانح کے معاملے میں یہ کتاب حرف آخر نہیں۔ مجھے علم ہے کہ اس میدان میں کچھ اور اہل علم تحقیق کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ان کی کاوشیں یقیناً مستند ہوں گی لیکن اگر میری یہ مساعی ان کے کام کو ذرا سا بھی سہل بنا سکیں تو میں اسے اپنی خوش نصیبی جانوں گا۔

اس کتاب کی تکمیل میں میرے بہت سے احباب نے ہاتھ بٹایا ہے۔ ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

رضا علی عابدی

۱۵ مئی ۲۰۰۰ء

لندن

بنجارے کی پیشین گوئی

ہوا یہ کہ شاہ جارج سوئم تو دیوانے ہو گئے۔

ان کی جگہ ان کے بیٹے جارج چہارم کو تخت پر بٹھایا گیا۔ انہیں بیماریوں اور موٹاپے نے آن دبوچا۔ ان کے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ ان کو کپڑے پہنانا دوبھر تھا۔ ان کا لباس ان کے تن پر رکھ کر سیا جاتا تھا۔ یہ کام بھی بیچارے درزیوں کے گھٹنوں کھا جاتا تھا۔

خود ان کو یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں وہ بھی پاگل نہ ہو جائیں۔ ان کے مرتے ہی ان کے تخت اور دولت پر ان کے لالچی، خود غرض اور نالائق بھائی قبضہ کر لیں گے اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ان کی اپنی بیٹی مر چکی تھی اور ان کے بھائیوں کی اولادیں بھی یا تو کمسنی ہی میں مر گئی تھیں یا سب کی سب ناجائز تھیں۔

اب لے دے کر ان کی ایک کم عمر اور یتیم بھتیجی الیکزانڈرینا وکٹوریا بچی تھی۔

یہ ان کے بھائی ایڈورڈ کی بیٹی تھی۔ ایڈورڈ سپاہی رہ چکے تھے اور بری طرح مقروض تھے۔ اپنی غریبی اور انگلستان کی مہنگائی سے تنگ آ کر وہ اپنی جرمن بیوی سمیت یورپ چلے گئے۔ وہیں کہیں مارے مارے پھر رہے تھے کہ مالٹا میں ان کی ملاقات خانہ بدوشوں سے ہوئی۔ جنوبی یورپ میں آباد یہ وہی بنجارے تھے جن کے دادا پردادا کبھی سندھ اور راجستھان سے چل کر عراق کے راستے یورپ پہنچے تھے۔ وہیں ایک خانہ بدوش نے ایڈورڈ کو بتایا کہ تمہارے گھر ملکہ پیدا ہونے والی ہے۔

یہ سوچ کر کہ انگلستان کی ملکہ انگلستان ہی میں پیدا ہونی چاہئے، انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی گھوڑا گاڑی نکالی اور چونکہ کوچوان کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تھے، خود ہی گاڑی ہانک کر انگلستان پہنچے جہاں وکٹوریا پیدا ہوئی۔ اس روز مئی کی ۲۴ تاریخ تھی۔ یہ سنہ ۱۸۱۹ء کی بات ہے۔

آٹھ ماہ بعد ایڈورڈ نمونیا سے چل بسے البتہ برطانیہ کے تخت کو اس کا وارث دے گئے۔

ماں بیٹی لندن کے کینسنگٹن پیلیس کے ایک مخدوش سے حصے میں رہنے لگیں۔

وکٹوریا کو پالنے پوسنے کا فرض ایک جرمن خاتون لیزن کو سونپا گیا۔ دونوں مل کر گڑیاں کھیلتیں اور کھیل ہی کھیل میں لڑکی کی تربیت ہوتی۔ لیزن نے دن رات ایک کردیئے، اس نے اپنی ہفتہ وار چھٹی تک ترک کردی۔

ننھی وکٹوریا کو پڑھنے لکھنے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر زبانیں سیکھنے کے معاملے میں قدرت نے اس کے ساتھ خاص رعایت برتی تھی۔ فرانسیسی اسے خوب آتی تھی۔ جرمن اس کی ماں کی زبان تھی۔ اسے آپیرا بہت پسند تھا جو اکثر اطالوی زبان میں ہوتا تھا، اس نے راتوں رات اطالوی بھی سیکھ لی جس کے ساتھ ہی شاعری سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ لاطینی اس زمانے کے بچوں کی طرح اس بھی پڑھائی گئی۔ اسے رقص اور موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا اور تصویریں تو وہ بہت جی لگا کر بناتی تھی، کبھی اپنے دل سے اور کبھی دوسروں کی بنائی ہوئی تصویروں کی نقل کر کے۔ یہ سلسلہ آخر دم تک چلا۔

اس نے واشنگٹن اروِنگ کی کتاب 'فتح غرناطہ' پڑھی اور مشرق کے اسرار جانے۔ اس نے کہا 'لیکن یہ سب تو خیالی قلعے ہیں، مگر انہیں بنانا مجھے اچھا لگتا ہے'۔ وہ کینسنگٹن پیلیس میں آنے والے گندمی رنگ کے ہندوستانی اور ایرانی مہمانوں کو دل ہی دل میں سراہنے لگی۔ یہ سلسلہ بھی آخر دم تک چلا۔

لیزن نے بچی کو اور کچھ سکھایا ہو یا نہ سکھایا ہو، اسے اپنا روزنامچہ لکھنے کی ایسی تربیت دی کہ آخر عمر میں ملکہ کی بینائی ساتھ چھوڑنے لگی لیکن ملکہ نے اپنی ڈائری لکھنا نہ چھوڑا۔

وکٹوریا گیارہ برس کی تھی۔ اُسے برطانوی بادشاہت کی تاریخ پڑھائی جارہی تھی۔ شاہی خاندان کا شجرہ پڑھتے پڑھتے اس نے کہا۔ "میری تخت نشینی تو قریب آگئی ہے"۔ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ جب یہ طوفان تھما تو اس نے لیزن سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں اچھی انسان بنوں گی"۔

شاہ جارج چہارم، جنہیں وہ 'بادشاہ چچا' کہا کرتی تھی، اسے شاہی باغات کی سیر کو لے جانے لگے اور شاہی سازندوں کی موسیقی سنوانے لگے۔ وہ کم سن بھتیجی کو بادشاہت کے لئے تیار کر رہے تھے۔

لیکن بیٹی سے زیادہ اس کی ماں 'مادرِ ملکہ' بننے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اپنے شوہر سے انہوں نے مقروض ہونا خوب سیکھ لیا تھا۔ اب جو انہیں احساس ہوا کہ ان کی بیٹی ملکہ بنے گی، انہوں نے ہر بینک سے قرضے لینے شروع کردیئے۔ آخر بینک بھی تنگ آگئے اور ادھار دینے سے انکار کرنے لگے۔ اسی دوران وہ شاہی خاندان کے افراد کے مالی امور کے نگراں جان کونرائے Conroy کو دل دے بیٹھیں۔ کونرائے نے

بھی دل لینے میں دیر نہیں لگائی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا وکٹوریا ابھی کم عمر ہے، وہ ملکہ بنے گی تو اسے ایک سرپرست کی ضرورت ہو گی جو پس منظر میں رہ کر حکومت چلائے گا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کام کے لئے خود اس سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ کونرائے اور وکٹوریا کی ماں نے مل کر ٹھانی کہ ہونے والی نوعمر ملکہ پر قابو پائیں گے۔ اس طرح نہ صرف لڑکی کی چٹیا بلکہ حکومت کی زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں اور پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی۔

لڑکی ابھی تخت پر بھی نہیں بیٹھی تھی کہ یہ محلاتی سازش شروع ہو گئی جس میں اس کی ماں شریک تھی۔ یہی سازش ملکہ کی پہلی بڑی آزمائش بننے والی تھی۔

کونرائے نے لڑکی پر پوری طرح قبضہ جمالیا۔ اسے کسی سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنی مرضی سے کچھ کرنا چاہتی تو سزا کے طور پر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے جاتے۔ اس کے چلنے پھرنے، کھانسنے اور چھینکنے تک کی کونرائے کو خبر کی جاتی۔ ایک خادم ہر وقت اس کا ہاتھ پکڑے رہتا کہ وہ کہیں گر کر خود کو زخمی نہ کر لے۔ اس کے سامنے جو کھانا رکھا جاتا پہلے ایک خادم اسے چکھ کر دیکھ لیتا کہ اس میں کہیں زہر تو نہیں ہے۔ کونرائے نہیں چاہتا تھا کہ سونے کا انڈا دینے والی بطخ یوں مر جائے۔ اسے مکمل یقین تھا کہ وہ وکٹوریا کا ذاتی سکریٹری بنے گا لیکن اسے صاف نظر آرہا تھا کہ لڑکی اسے ناپسند کرتی ہے۔ خود اسے لڑکی کب اچھی لگتی تھی۔ وکٹوریا کو وہ 'چھوٹی عورت' کہا کرتا تھا۔ جیسے جیسے کونرائے کی شرانگیزی بڑھی، ویسے ویسے لڑکی اپنی مزاحمت اور مدافعت کی لو اونچی کرتی گئی۔

پھر یہ ہوا کہ خود وکٹوریا کی زندگی کی لو ٹمٹمانے لگی۔ یہ سنہ ۱۸۳۵ کی بات ہے۔ وہ سولہ برس سے اوپر کی ہو چکی تھی۔ اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ اس کا بدن بخار سے پھنکنے لگا۔ ایک لیزن تھی جو ہر وقت اس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اور جس وقت وکٹوریا کی آنکھیں دھنس رہی تھیں اور سر کے بال گر رہے تھے، جان کونرائے اس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ اعلان کردے کہ کونرائے ہی اس کا سرپرست ہو گا۔ آخر ایک روز کمزور لڑکی نے مشکل سے اپنا چہرہ کونرائے کی طرف پھیرا اور دھیمے سے بولی۔ "نہیں"۔

وکٹوریا کے باپ فوجی تھے۔ یہ بات لڑکی کے کان میں آہستہ آہستہ کہی جاتی رہی اور اسے سمجھایا گیا کہ خود کو ہمیشہ سپاہی کی بیٹی سمجھنا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وکٹوریا اندر سے سپاہی ہو گئی۔ قسمت کے ہر ستم کے آگے وہ چٹان بن گئی۔ اس نے پیر جما کر کھڑا ہونا سیکھا۔ وہ وفاداروں پر جان چھڑکنے لگی اور دشمنوں کے خلاف ڈٹ گئی۔ اس کی ایک سوانح میں بجا طور پر لکھا ہے کہ اس نے ایک سپاہی کا ضابطۂ اخلاق اختیار کر لیا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولی، اس نے اپنے دوستوں کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا، وہ کبھی پسپا نہیں ہوئی، اس نے اپنی قوتِ برداشت کے بل بوتے پر فتح پائی، جس نے اس کی عزت کی، وکٹوریا نے اس کا احترام کیا۔ اسے فریب اور سازش سے نفرت تھی۔ اس نے تباہیوں سے ٹکرا جانا اور ان پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔

عہدِ وکٹوریا شروع ہوتا ہے

اس دوران شاہ جارج مرے۔ ان کے بعد ان کے بھائی ولیم چہارم تخت پر بیٹھے لیکن ان کی زندگانی کا چراغ جلد ہی ٹمٹمانے لگا۔ انہوں نے اپنی بھتیجی کی اٹھارہویں سالگرہ تو دیکھ لی، اب انہیں معرکہ واٹرلو کی سال گرہ دیکھنے کا ارمان تھا۔ ۱۸ جون کو یہ مرحلہ طے ہوتے ہی انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ یہ بات سنہ ۱۸۳۷ کی ہے۔

بادشاہ کے مرتے ہی آرچ بشپ، لارڈ چیمبر لین اور بادشاہ کے معالج اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے وکٹوریہ کی قیام گاہ کی طرف لپکے جہاں انہوں نے دیکھا کہ گیٹ بند ہے اور دربان خراٹے لے رہا ہے۔ بہت گھنٹیاں بجائی گئیں، بڑی مشکل سے دروازہ کھلا لیکن اندر سے جواب آیا کہ شہزادی سو رہی ہے۔ مگر جب نوواردوں نے کہا کہ وہ شہزادی سے نہیں، ملکہ سے ملنے آئے ہیں تو ماں نے جاکر اور منہ چوم کر اٹھایا۔

وکٹوریہ اپنے شب خوابی کے لباس کے اوپر ڈریسنگ گاؤن اور سلیپریں پہن کر ملاقاتیوں کے پاس آئیں۔ انہیں دیکھتے ہی ملاقاتیوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اب لارڈ چیمبر لین نے سارا احوال کہنا شروع کیا اور جوں ہی وہ لفظ 'ملکہ' پر پہنچے، ملکہ نے اپنا ایک ہاتھ بوسے کے لئے ان کی طرف بڑھادیا اور اتنے اشتیاق سے بڑھایا کہ اگر شاہی آداب اجازت دیتے تو وہ دونوں ہاتھ بڑھاتیں۔

یہیں سے عہدِ وکٹوریا شروع ہوتا ہے۔

وہ بڑی شان سے تخت پر بیٹھی۔ اس کے وزیروں اور درباریوں کی عمریں اس سے تین اور چار گنی تھیں۔ مگر اس کے انداز ایسے تھے کہ ایک سوانح نگار نے لکھا کہ حکمرانی کے چھٹے دن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چھ سال سے تخت پر بیٹھی ہے۔ سوانح نگار کو کیا خبر تھی کہ اسی تخت پر وہ ساٹھ سال براجمان رہے گی بلکہ چھ کم ستر۔

وکٹوریا نے ونڈسر کاسل میں دنیا بھر سے آئی ہوئی دولت کے انبار دیکھے تو حیران رہ گئی۔ چمکتے دمکتے جواہرات سے بھرے کمرے، سونے چاندی کے ظروف، ہندوستان سے آیا ہوا مال و زر، ٹیپو صاحب کے ہاں سے سمیٹا ہوا خزانہ جس میں سونے کے شیر کا سر اور وہ مور بھی شامل تھا جس کے جھلملاتے پروں میں لعل اور زمرد جڑے ہوئے تھے، یہ سب اب اس کے تھے۔

وہ مختلف چیزیں پہن کر اپنی خادماؤں سے پوچھتی کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ پھر وہ خود ہی کہتی کہ کیا کروں، میرا قد بہت چھوٹا اور ہاتھ بدصورت ہیں۔ ہاتھوں کا تو اس نے یہ علاج نکالا کہ انگلیوں میں جتنی انگوٹھیاں چڑھا سکتی تھی، چڑھا لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھانا کھانے بیٹھتی تو سارے چھری کانٹے، چمچے اور پلیٹیں ٹھن ٹھن بولتی رہتیں۔ اس کی ہم عمر خادمائیں اس کی ہمجولیاں بن گئی تھیں، وہ سب مل کر ہنستیں، البتہ ملکہ کے گول مٹول بدن، مستقل کھلے ہوئے منہ، ذرا سے بد ہیئت ہونٹوں اور معمولی سی ترچھی آنکھوں کو کوئی کچھ نہ کہتا۔ کسی نے یہ خادمائیں بھی چن کر رکھی تھیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی لڑکی ملکہ کے مقابلے میں خوش شکل نہ ہو۔

ملکہ اپنے ملازموں کا بہت زیادہ خیال رکھتیں۔ یہاں تک کہ ان کمسن بچوں پر انہیں بہت پیار آتا جو محل کی چمنیوں اور دھوانروں میں اتر کر انہیں صاف کیا کرتے تھے۔ یہ دھوانرے اتنے تنگ ہوتے تھے کہ ان میں بچے ہی اتر سکتے تھے لہٰذا یہ مشقت ان سے لی جاتی۔ بارہا وہ گرتے اور ہاتھ پیر توڑتے۔ ملکہ ان کے لئے آنسو بہاتیں۔ ان میں کم سے کم دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔

سنہ ۳۸ کے جاڑے تھے کہ لندن میں ایک نئی قیامت برپا ہوئی۔ کہیں سے ایک بلا آ گئی جو اکیلی دکیلی عورتوں کے سامنے اچانک نمودار ہوتی اور بے چاری عورتیں وہیں غش کھا کر گر پڑتیں۔ اخباروں کے ہاتھ یہ ایک نیا شوشہ لگا اور انہوں نے اس بلا کو جیک کا نام دے کر اس کی ایسی بھیانک کہانیاں چھاپیں کہ عورتوں نے گھروں سے نکلنا بند کر دیا۔ کبھی وہ شخص ریچھ کی شکل میں نظر آتا، کبھی بیل کی۔ کہیں عورتوں نے بتایا کہ وہ بن مانس جیسا نظر آیا۔ کہیں اسے پولیس کی وردی میں دیکھا گیا۔ مشرقی لندن کی ایک عورت پر اس نے حملہ کیا تو اس نے بتایا کہ اس کے منہ سے نیلے اور سفید شعلے نکل رہے تھے۔ پھر اسے ملکہ کے محل کی دیواروں پر چڑھتے ہوئے اور چھت پر گھومتے ہوئے، یہاں تک کہ شاہی محل میں رقص کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ ایک طرف عورتوں کی روح فنا ہو رہی تھی، دوسری جانب اخباروں اور رسالوں کی چاندی ہو رہی تھی کیونکہ وہ خوب فروخت ہو رہے تھے۔

لیکن جوں ہی ملکہ کی تاج پوشی کا وقت قریب آیا، وہ جیک ایسا غائب ہوا کہ بس اب کتابوں ہی میں اس کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ موسم گرما اس سال بہت خوش گوار تھا۔ پورے برطانیہ سے لوگ تاج پوشی کا جلوس دیکھنے لندن پہنچنے لگے۔ ریل گاڑیاں نئی نئی چلی تھیں، وہ اس شان سے لندن پہنچتیں کہ ان میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ سارے ہوٹل بھر گئے۔ کوئی سرائے خالی نہ رہی۔ لوگوں نے اپنے مکان اور دکانیں تک کرائے پر دینی شروع کر دیں اور مسافروں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔

۲۸ جون کی صبح، انیس سال کی لڑکی برطانیہ کا تاج پہننے چلی۔ رات بھر کے جاگے ہوئے لندن والے ملکہ کا جلوس دیکھنے سڑکوں پر نکل آئے۔ خود ملکہ کو اچھی نیند نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے وزیر اعظم لارڈ ملبرن سے کہا کہ طبیعت اچھی نہیں۔ وہ بولے کہ جب سر پر تاج رکھا جائے گا تو سب اچھا ہو جائے گا۔

صبح تک بارش ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں لیکن جیسے ہی ملکہ کا جلوس محل سے روانہ ہوا، ہر طرف اجالا ہو گیا۔ گرم دھوپ چمکنے لگے اور لوگ بولے کہ تقریبات میں قدرت بھی شریک ہے۔

تالیوں کے شور میں وہ ویسٹ منسٹر ایبے میں داخل ہوئیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ کسی نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے لڑکی کی سال گرہ ہے۔ انہیں سینٹ ایڈورڈ کی کرسی پر بیٹھایا گیا۔ جس وقت آرچ بشپ نے ان کے سر پر تاج رکھا، کلیسا کی کسی اونچی کھڑکی سے سورج کی کرنیں ان کے سر پر گر رہی تھیں۔ نقرئی بگل گونجے اور آرچ بشپ نے وکٹوریا کا رخ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی طرف پھیر کر گویا عوام کو ان کی ملکہ پیش کی۔

اس دن خوب حماقتیں بھی ہوئیں۔ آرچ بشپ نے شاہی انگوٹھی زبردستی چوتھی انگلی میں چڑھا دی حالانکہ وہ پانچویں انگلی کے ناپ سے بنائی گئی تھی۔ ایک نوے سالہ لارڈ ملکہ کو خراج پیش کرنے تخت کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے کہ خود اپنے لباس میں الجھ کر گرے اور نیچے تک لڑھکتے گئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ لارڈ صاحب دوبارہ چڑھنے کے لئے پر تول رہے تھے کہ ملکہ خود ہی نیچے جھکیں اور انہیں دوبارہ گرنے سے بچالیا۔

پانچ گھنٹے کی تقریبات سے فرصت ملی تو شاہی لباس میں لدی پھندی ملکہ اپنے محل کو لوٹیں۔ ابھی انہیں ایک اور فرض انجام دینا تھا۔ محل کے زینے کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنا خوب گھیر دار لباس سمیٹا اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف دوڑیں جہاں انہیں اپنے کتے کو غسل دینا تھا۔

سال کے خاتمے تک ہر طرف یہ ذکر تھا کہ ملکہ کا لڑکپن رخصت ہو رہا ہے۔ خود ملکہ کو اپنی صحت کی طرف سے فکر لاحق ہوئی۔ ان کے روزنامچے میں لکھا ہے۔ "اف خدا۔ میرا وزن آٹھ اسٹون تیرہ پاؤنڈ ہو گیا ہے"۔ ان ہی دنوں پیرس میں یہ خبر گرم ہوئی کہ نو عمر ملکہ کا سارا لباس تنگ ہو گیا ہے۔ خبر کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ ملکہ کو تنگ لباس سے چڑ تھی اور ان کے درزیوں کو ایک سائز بڑا لباس سینے کا حکم ہوا تھا۔

وزیر اعظم، لارڈ ملبرن Melbourne نے سمجھایا کہ یہ صورت حال خاندانی ہے اور یہ موٹاپے کی طرف مائل ہونا انہیں اپنی پھوپی سے ورثہ میں ملا ہے۔ موٹاپے کے ساتھ ملکہ سست اور کاہل بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ صبح دیر تک بستر میں پڑی رہتیں اور رات کو دیر سے نہاتیں تاکہ بار بار لباس اتارنے اور پہننے کی زحمت سے بچ جائیں۔

بڑوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ موٹاپے سے بچنا چاہتی ہیں تو پیدل چلا کریں۔ اس پر ملکہ نے کہا کہ وہ پیدل چلتی ہیں تو جوتوں میں کنکر آ جاتے ہیں۔

وکٹوریا کو اپنے حلیے کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ ان کی ٹھوڑی بہت چھوٹی تھی۔ انگلیاں بھدی تھیں جنھیں چھپانے کے لئے وہ اتنی انگوٹھیاں پہن لیتی تھیں کہ پھر دستانے پہننا مشکل ہو جاتا تھے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا قد ذرا سا تھا۔

شادی، محل آبادی

وکٹوریا کی حاکمیت کو ایک سال پورا ہو گیا۔ اب وہ بیس برس کی ہو رہی تھیں۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ اگر لڑکی بیس سال تک بن بیاہی رہے تو پھر وہ کنواری ہی رہ جاتی ہے۔

ان ہی دنوں افواہیں اڑیں کہ ملکہ اپنے وزیرِ اعظم لارڈ ملبرن سے شادی کریں گی جن کے ساتھ وہ قریب قریب سارا ہی وقت گزارتی تھیں۔ وزیرِ اعظم اُس وقت کوئی ساٹھ برس کے تھے۔ وہ بہت مقبول تھے، دولت مند تھے، خوش شکل تھے اور شادی شدہ نہ تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود انہوں نے کبھی اس افواہ کی تردید نہیں کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ملکہ کو ان سے محبت ضرور تھی لیکن ان کی حیثیت ایک استاد، بزرگ، رہنما اور باپ کی سی تھی۔

جب وزیرِ اعظم نے ملکہ کو بتایا کہ دارالعوام میں ان کی وہگ پارٹی کی اکثریت برائے نام رہ گئی ہے اور وہ استعفادے رہے ہیں تو ملکہ ان کا ہاتھ تھام کر خوب روئیں اور کئی روز تک روتی رہیں۔ کسی نے شادی کی بات کی تو کہنے لگیں کہ میرا کسی کے ساتھ نباہ ہونا مشکل ہے۔ لارڈ ملبرن سے انہوں نے کہا کہ مجھے اس ہر وقت کی سیاست سے نفرت ہو گئی ہے۔ ان کا کھانا پینا بہت بڑھ گیا۔ ان پر اکتاہٹ سی طاری رہنے لگی اور وہ سوچنے لگیں کہ شاید وہ بزرگوں کی خاندانی دیوانگی میں مبتلا ہو رہی ہیں۔

ان کی چہیتی ملازمہ لیزن پہلے تو ملکہ اور لارڈ ملبرن کے قرب سے جلتی رہی اور جب البرٹ سے شادی کی بات چھڑی تو لیزن نے ملکہ کے کان میں یہ بات پھونکنی شروع کی اس کے چچا اس کی شادی کرا کے اس کے شوہر البرٹ کی آڑ میں حکومت پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔

وکٹوریا کو اپنی ماں اور ان کے رفیق کونرائے سے سخت چڑ تھی۔ دونوں ابھی تک کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ملکہ ان کے لئے بھاری وظیفے کی منظوری دے دیں۔ ابھی یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ وکٹوریا سے ایک ایسی بھول ہوئی جس پر سڑک چلتے لوگ تک انہیں برا کہنے لگے۔ ہوا یہ کہ ماں کی بن بیاہی اور دبلی پتلی ملازمہ

فلورا کا پیٹ بڑھنا شروع ہوا۔ ملکہ کو وہ لڑکی پہلے ہی ناپسند تھی۔ خدا جانے کس نے ملکہ کو کیا بجھایا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ فلورا حاملہ ہے اور یہ کہ ہو یا نہ ہو، یہ بچہ کونرائے کا ہے۔

ملکہ اپنی بات پر بے رحمی کی حد تک اڑی رہیں۔ ان کے ذاتی معالج اور ایک ماہر نے لڑکی کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ کنواری ہے اور کسی پیچیدہ بیماری کا شکار ہے۔ ماں نے ملکہ سے احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ وہ فلورا سے معافی مانگیں۔ اور تو اور محل کی خادمائیں دو پارٹیوں میں بٹ گئیں اور ان میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ ٹوری پارٹی والوں نے الزام لگایا کہ یہ وہگ ذہنیت کی عورتیں ہیں جو ایک مظلومہ کو اپنی اذیت پسندی کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ ٹوری اخباروں نے اس معاملے کو خوب خوب اچھال کر ملکہ کو بدنام کیا۔

اس دوران ملبرن کی وہگ حکومت گری اور ٹوری وزیر اعظم سر رابرٹ پیل Peel ملکہ سے ملنے گئے تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ محل کی وہگ ملازمائیں نکال کر ان کی جگہ ٹوری خادمائیں رکھی جائیں۔ اس موقع پر وکٹوریا کے اندر کا سپاہی جاگا۔ وہ تن کر بیٹھ گئیں اور بولیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ وزیر اعظم ڈر گئے۔

ادھر فلورا کی حالت بگڑتی گئی۔ وکٹوریا تو ملازماؤں کی خبر گیری کے معاملے میں شہرت رکھتی تھیں۔ لیکن اس لڑکی کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ فلورا کے پیٹ میں کونرائے کا بچہ ہے۔ کچھ روز بعد لڑکی مر گئی۔ ملکہ اسے دیکھنے تک نہیں گئیں، بلکہ کسی سے انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے گھرانے میں مرتے ہوئے لوگوں کی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔

فلورا کی میت کا پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں بچہ نہیں بلکہ بری طرح بڑھا ہوا جگر تھا۔ لڑکی کی حرمت سلامت رہی۔ ملکہ کی شہرت کو بٹہ لگا۔ انہوں نے ملبرن Melbourne کو بتایا کہ وہ محل کے باغ میں ٹہل رہی تھیں کہ ان کا جی چاہا کہ گھاس پر لیٹ کر خوب لوٹیں۔

اس دوران ان کے چہیتے وزیر اعظم ملبرن کی حکومت لوٹ آئی لیکن ملکہ کا قرار لوٹ کر نہیں آیا۔ انہوں نے ملبرن سے کہا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، البرٹ سے ان کی شادی کا قصہ سر دست ملتوی سمجھا جائے۔

۱۰ اکتوبر ۱۸۳۹ء کا دن انہیں ہمیشہ یاد رہا۔ صبح وہ سو کر اٹھیں تو پتہ چلا کہ کوئی دیوانہ ان کے ونڈسر کے محل کی کھڑکیاں توڑ گیا ہے۔ ملکہ اور ملبرن نے ایک رات پہلے سور کا گوشت کھایا تھا۔ صبح اٹھے تو دونوں کی طبیعت خراب تھی۔ ملکہ ٹہلنے کے لئے باغ میں نکلیں تا کہ سر کا درد دور ہو۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ

ایک اردلی ہاتھ میں خط لئے ان کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ یہ ان کے چچا شاہ لیوپولڈ Leopold کا خط تھا جس میں لکھا تھا کہ ملکہ کے چچیرے بھائی البرٹ اور ارنسٹ اسی شام آرہے ہیں۔

البرٹ بے چارا طے کر کے آیا تھا کہ اس بار ونڈسر میں یا تو وہ ملکہ سے بیاہا جائے گا یا بری طرح ٹھکرایا جائے گا۔ پھر بھی وہ سر اٹھائے محل میں داخل ہوا۔ ملکہ نے جب اسے پہلے پہل دیکھا تھا تو دونوں سولہ برس کے تھے۔ اب کے وہ بیس برس کا شاندار جوان تھا۔ اس کا نکلتا ہوا قد، رنگت میں ذرا سی پیلاہٹ اور اس پر گہری رنگت کا سفری لباس دیکھ کر وکٹوریا مسکرائیں۔ اس رات انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ البرٹ کتنا خوب صورت ہے۔

ملبرن نے وکٹوریا سے کہا کہ ہفتے بھر سوچ کر فیصلہ کرو۔ ملکہ نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی اور اگلے ہی روز پتہ چلا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر وزیر اعظم نے یہ بات انگریزی میں کہی ہو گی کہ نیک کام میں دیر کا ہے کی؟ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ فوراً ہی طے پا گیا کہ شادی پارلیمان کے اجلاس کے بعد فروری میں ہو گی اور البرٹ کو سارے شاہی اعزاز دیئے جائیں گے۔ چلتے وقت ملبرن بولے۔ "عورت چاہے کیسے ہی حالات میں ہو، زیادہ عرصے تنہا نہیں رہ سکتی"۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رخصت کے وقت وکٹوریا نے ان کا ہاتھ تھاما اور کہا کہ اس ساری پدرانہ شفقت کا شکریہ۔

اس رات جب شب بخیر کہنے کا وقت آیا اور وکٹوریا اور البرٹ نے ہاتھ ملائے تو اس بار گرمجوشی ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ اگلے روز ملکہ نے البرٹ کو طلب کیا۔ اس وقت دونوں جانتے تھے کہ کیا بات ہونے والی ہے اور ہوئی بھی وہی بات۔ ملکہ نے اسے شادی کی پیش کش کی۔ دونوں بغل گیر ہوئے اور البرٹ نے جرمن زبان میں خدا جانے کیا کیا کہا۔ بس یہ بات سنی گئی کہ اب میری ساری عمر تمہارے ساتھ گزرے گی۔

انہوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں دیں اور اپنے اپنے بالوں کی لٹیں کاٹ کر دیں۔ دونوں گھنٹوں رقص کرتے رہے۔ البرٹ نے ملکہ کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کئے یہاں تک کہ وہ خوشی سے رونے لگیں۔ پھر ایک روز دونوں نے اپنے اپنے روزنامچے ایک دوسرے کو دکھائے کہ منگنی کے دن انہوں نے کیا لکھا تھا۔ آخر البرٹ کے جانے کا وقت آپہنچا۔ اس روز بھی ہونے والی دلہن خوب روئی۔

اس کے جانے کے بعد ایک روز ملکہ نے ملبرن سے معافی مانگی کہ پچھلے دنوں وہ اپنے بزرگ دوست کو توجہ نہ دے سکی کیونکہ اس کا دھیان ایک ہی طرف لگا تھا۔ اس پر ملبرن نے بڑی شفقت سے کہا۔ "فطری بات ہے"۔

ملکہ نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ "یوں لگتا ہے کہ میں ہی سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوں"۔

البرٹ نے اپنے بھائی ارنسٹ سے کہا۔ "وکٹوریا مجھ پر اتنی مہربان ہیں کہ یقین نہیں آتا میرے لئے اتنی محبت کا اظہار کیا جائے گا"۔

جب رعیت کو اس رشتے کا علم ہوا تو کچھ لوگ خوش، کچھ ناخوش ہوئے۔ جو ناخوش تھے ان کا خیال تھا کہ ملکہ کی دولت بٹورنے کے خواہش مندوں میں ایک اور اضافہ ہوا۔ لندن کی سڑکوں پر گانے والوں نے ایک گانا بنایا جس میں وہ کہتے تھے کہ ایک شخص آرہا ہے، انگلستان کی پھولی ہوئی ملکہ اور اس کا پھولا ہوا بٹوہ لے جانے کے لئے۔

شاہی شادی کے روز ایسے زور کی بارش ہوئی کہ قصر بکنگھم کے گرد کا علاقہ دلدل بن گیا۔ اوپر سے ہوا کے ایسے جھکڑ چلے کہ درخت گرے اور چھتیں اڑ گئیں۔ جس وقت ملکہ گرجا گھر میں آئیں، شرابور مجمع کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ لوگوں نے جیسے تیسے تالیاں بجائیں اور اپنے گھروں کو بھاگے۔ یہ ۱۰ فروری ۱۸۴۰ء کی بات ہے۔

دولہا دلہن نے تین دن ونڈسر میں گزارے جس کے بعد ملکہ اپنے حکمرانی کے فرائض ادا کرنے لندن لوٹ آئیں۔ مشکل سے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ملکہ کو متلی شروع ہو گئی۔ پھر تو یہ ہوا کہ جب تک البرٹ زندہ رہے ملکہ کو متلیوں پر متلیاں ہوتی رہیں۔ ان کے ہاں نو بچے ہوئے اور جب یقین ہو گیا کہ اور بچے نہیں ہوں گے، اس وقت بھی وہ یہی کہتی تھیں کہ کاش ایک دو اور ہو گئے ہوتے۔

کچھ عرصے بعد البرٹ کو احساس ہوا کہ وکٹوریا سرکاری کاغذ اور خفیہ دستاویزیں انہیں نہیں دکھاتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس پر میاں بیوی میں کشیدگی نظر آنے لگی۔ البرٹ نے محسوس کیا کہ یہ سب کچھ ملکہ کی چہیتی ملازمہ لیزن کا کیا دھرا ہے۔ خود ملکہ لیزن کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہ تھیں۔ وفاداری کا ان کی تصور اوروں سے مختلف تھا۔

ان کی طبیعت ہر وقت خراب رہتی اور البرٹ ہر لمحہ ان کی پالکی سے لگے بیٹھے رہتے۔ ایک دن وہ دونوں اپنی چھوٹی سے گھوڑا گاڑی میں گرین پارک کی سیر کر رہے تھے کہ ایک لڑکے نے ان پر پستول سے گولی چلائی، پھر اس نے قریب آکر دوسرے پستول سے ایک اور فائر کیا۔ البرٹ نے ملکہ کو اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ دونوں گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزریں اور ایک گولی سامنے دیوار میں پیوست ہو گئی۔ پارک میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اس واقعے کی خبر سن کر شاید سارا شہر دیوار میں گولی کا نشان دیکھنے آیا اور اس

سوراخ کو چھتریوں اور چھڑیوں کی نوکوں سے اتنا کریدا گیا کہ وہاں اچھا خاصا گڑھا سا بن گیا۔ شاید اب بھی ہو، امرتسر کے جلیاں والا باغ کی طرح۔

بچے کی ولادت کا وقت قریب آ رہا تھا۔ وکٹوریا نے اپنے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا زچگی میں بہت تکلیف ہو گی؟ ڈاکٹر نے کہا کہ یقین ہے آپ برداشت کر لیں گی۔ ملکہ نے کہا کہ اوروں کے ہاں بھی تو ولادت ہوتی ہے، میں بھی ان ہی کی طرح تکلیف جھیل جاؤں گی۔

برطانیہ کی روایت یہ تھی کہ ملکہ کے ہاں ولادت کے وقت سارے درباری اور تمام وزیر سفیر زچہ خانے میں موجود رہا کرتے تھے۔ صدیوں تک ملکائیں بھرے مجمع کے سامنے بچے جنتی رہیں۔ وکٹوریا نے اعلان کر دیا کہ خبردار جو کسی غیر مرد نے زچہ خانے میں قدم بھی رکھا۔

ابھی ولادت میں کئی ہفتے باقی تھے کہ ۲۱ نومبر کی صبح ملکہ کو درد شروع ہوا۔ ابھی تو بچے کے کپڑے، گھیے اور توشک بھی تیار نہیں تھی۔ خود ڈاکٹر پریشان ہو گئے۔ بارہ گھنٹے کے درد کے بعد ولادت ہوئی۔

ڈاکٹر نے ذرا سے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”مادام، آپ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے“۔

ملکہ نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ اگلی بار شہزادہ ہو گا“۔

ہنسی خوشی کے برس

سنہ چالیس اپنے خاتمے کے قریب تھا کہ محل میں ایک عجب واقعہ ہوا۔

رات کے ڈیڑھ بجے تھے۔ ملکہ کی نرس اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ایک بار جو اس کی آنکھ کھلی، اسے محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ ڈر کے مارے اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس نے پوچھا کہ کون ہے لیکن داخل ہونے والے نے آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اب تو نرس کی گھگی بندھ گئی۔ ملکہ کا ایک اردلی دوڑا آیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جھک کر صوفے کے نیچے دیکھا اور سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ اتنے میں لیزن داخل ہوئی اور بڑی بہادری سے صوفے کو دھکیلا۔ دیکھا کہ اس کے نیچے ایک لڑکا چھپا ہوا ہے جسے وقت بے وقت محل میں گھسنے کا شوق تھا۔

البرٹ نے اعلان کیا کہ محل میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس پر لیزن اڑ گئی اور لگی مخالفت کرنے۔ اس وقت ملکہ کے شوہر نے طے کر لیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس صوفے کی ہیروئین کو چلتا کیا جائے۔ البرٹ کو یقین تھا کہ لیزن ملکہ پر پورا قبضہ چاہتی ہے اور نہ صرف یہ کہ ان کے ہر کام میں ٹانگ اڑا رہی ہے بلکہ میاں بیوی میں جھگڑے کرانا چاہتی ہے۔ وہ ستاون برس کی ہو چکی تھی اور یہی اس کے ریٹائرمنٹ کا وقت تھا لیکن وہ اپنی اکیس برس کی مالکہ سے جدا ہونے پر راضی نہ تھی۔ البرٹ نے وزیر اعظم سے شکایت کی کہ یہ پاجی اور احمق سازشی عورت ہر کام میں مداخلت کر رہی ہے۔ ایک بار تو البرٹ نے لیزن سے کہا بھی کہ وہ چلی جائے۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ملکہ کے محل سے مجھے نکالنے کا تمہیں کوئی اختیار نہیں۔

لیزن کو نکالنا یوں بھی مشکل تھا کہ ملکہ اسے بے حد عزیز جانتی تھیں۔ اس طرح کی کارروائی سے وہ بہت پریشان ہوتیں اور اس کے لئے یہ وقت یوں بھی مناسب نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر امید سے تھیں۔

اس بار کی زچگی بھی کچھ آسان نہ تھی۔ ملکہ کی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی۔ ان کا پیٹ اتنا بڑھا

کہ ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ بے چارے البرٹ ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے اور اگر کہیں چلے جاتے تو ملکہ اپنی بے چارگی کی شکایت کرنے لگتیں۔ البرٹ کہتے کہ لگتا ہے اب کے آپ کے ہاں بیٹا ہونے والا ہے۔

کئی بار کے مصنوعی دردوں کے بعد اصل درد زہ ہوا اور جب بقول ملکہ 'ان کے کاندھے کا بوجھ' اتر گیا تو ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ ان کے ہاں ایک نہایت عمدہ بیٹا ہوا ہے۔

ولی عہد کی ولادت کی خوشی میں جوں ہی کلیساؤں کے گھنٹے بجے اور توپیں داغی گئیں تو لندن والے ناچتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ اس سے پہلے کسی ولی عہد کا پیدا ہونا کسی کو یاد نہ تھا۔

ان ہی دنوں خبر آئی کہ جو بہت بڑی انگریز فوج کابل بھیجی گئی تھی، افغانوں نے اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا ہے اور اس قتل عام کی داستان سنانے کے لیے صرف ایک فوجی کو واپس بھیج دیا ہے۔

ملکہ وکٹوریا کی ڈائری میں اس جنگ کا ذکر برائے نام ہے کیونکہ اُن ہی دنوں خود محل کے اندر ایک اچھی بھلی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

ملکہ کی بیٹی وکی اب ایک برس کی ہو رہی تھی اور باپ سے بہت ہلی ہوئی تھی لیکن اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ ایک روز البرٹ نے کہیں یہ کہہ دیا کہ بچی کی نرس اور لیزن، یہ دونوں لڑکی کی جان لینے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ وکٹوریا آگ بگولا ہو گئیں۔ وہ البرٹ پر خوب چیخیں چلائیں اور یہ تک کہا کہ تم چاہو تو بچی کو مار ڈالو اور یہ کہ میں تو یہ شادی کر کے پچھتائی۔

البرٹ نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔

انہیں یقین تھا کہ لیزن ان کے خلاف ملکہ کے کانوں میں زہر گھول رہی ہے۔

آخر لیزن کو جانا پڑا۔ وہ یورپ روانہ ہونے لگی تو ملکہ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیزن چلی گئی۔ اس کا جانا تھا کہ محل میں آسودگی سی آ گئی۔ بچی کی صحت اچھی ہونے لگی اور میاں بیوی کے تعلقات سدھرنے لگے۔

ان ہی دنوں تین لاکھ سے زیادہ دستخطوں سے ایک عرض داشت پارلیمان کو پیش کی گئی جس میں لکھا تھا کہ ملک کے نظام میں کبھی غریبوں کی بات بھی سنی جائے گی یا عوام پر ہمیشہ ٹوری اور وگ روسا ہی سواری گانٹھیں گے؟ چیلز چارٹر نام کی یہ دستاویز برطانوی جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی پر کنکر بن کر گری۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ کون سا انصاف ہے کہ صرف چند مالدار لاکھوں نادار محنت کشوں پر حکمرانی کریں،

روساہی ووٹ دیں، روساہی منتخب ہوں اور غریبوں کو ووٹ تک کا حق نہ ہو۔

عین ان ہی دنوں لاکھوں پاؤنڈ کے صرفے سے قصر بکنگھم سجایا گیا اور وہاں رات بھر رقص ہوا۔ رقص کے دوران البرٹ کی پیٹی میں جڑا ہوا ایک بے حد قیمتی ہیرا کھو گیا۔ سارے ملک میں لوگ حساب لگانے لگے کہ اس ہیرے کو اگر بیچا جاتا تو سینکڑوں کنبے کتنے مہینے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتے تھے۔ اخباروں، رسالوں اور نجی محفلوں میں، غرض ہر طرف یہ نیا موضوع چھڑ گیا۔

شاہی محل میں صرف ایک شخص کو احساس ہوا کہ وقت بدل رہا ہے، اب قدریں بھی بدلنی چاہئیں۔ اور وہ شخص تھا، ملکہ کا شوہر البرٹ۔

خود ملکہ کی مصروفیت جدا تھی۔ وہ تیسری مرتبہ امید سے تھیں۔

اب وہ زیادہ سے زیادہ سرکاری کام البرٹ کو سونپنے لگیں یہاں تک کہ جن صندوقوں میں خفیہ کاغذ آتے تھے، ملکہ نے ان کی چابیاں شوہر کے حوالے کر دیں۔ یہ غیر معمولی اعتبار کی پہلی علامت تھی۔ حکمرانی کی ذمے داریاں وکٹوریا کے ہاتھ سے نکل کر البرٹ کے ہاتھوں میں جانے لگیں۔ خود ملکہ اس پر بہت خوش تھیں۔

انہوں نے اپنے دوست، رفیق، شفیق، عزیز، سرپرست، نگراں اور استاد، لارڈ ملبرن کو ہمیشہ یہ کہتے سنا تھا کہ لکھنا پڑھنا عورتوں کا کام نہیں۔ دنیا کا نظام مرد چلاتے ہیں اور اگر اس میں کبھی کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو اکثر اس کی ذمے دار عورتیں ہوتی ہیں۔ شاہ ہنری ہشتم ان کے ہیرو تھے جنہوں نے اپنی چھ بیویوں میں سے دو کی گردن ماری، ایک کو طلاق دی اور باقی تین میں سے دو کو عمر بھر جلا جلا کر مارا۔ ملبرن کہا کرتے تھے کہ مرد ہو تو ایسا ہو۔ عورت کا تو بس ایک ہی کام ہے کہ سر جھکا کر مرد کی اطاعت کیے جائے۔

وکٹوریا نے یہ بات گرہ سے باندھ لی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اسی کا نتیجہ تھا یا نہیں لیکن ملکہ کے ہاں تیسرا بچہ ہنستے کھیلتے پیدا ہوا۔ اس بار ان کے ہاں ایک تندرست، توانا اور خوب صورت بیٹی پیدا ہوئی۔ پہلی بیٹی وکی کہلائی، بیٹے کا نام برٹی پڑا اور یہ خوبرو بچی ایلس کے نام سے پکاری گئی۔

یہی وکٹوریا کی زندگی کے ہنسی خوشی کے برس تھے۔

اب اگر کوئی مسئلہ تھا تو یہ کہ لندن کے قصر بکنگھم میں گندے پانی کی نکاسی کا نظام اتنا ناقص ہو چلا تھا کہ سارے محل میں بدبو بھری رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی کھڑکیوں سے اندر کے سارے منظر صاف

نظر آتے تھے اور نہ صرف یہ کہ راہ گیر کھڑے ملکہ کے شب خوابی کے کمرے میں جھانکا کرتے تھے بلکہ موقع ملتا تو چوری چھپے اندر چلے آتے اور کئی کئی دن شاہی میزبانی کا لطف اٹھاتے۔

ایک روز ملکہ نے البرٹ سے کہا کہ ہمارا اپنا اور علاحدہ گھر ہونا چاہیے۔

اب کیا تھا۔ البرٹ لگ پڑے اور انگلستان سے لگے ہوئے جزیرے آئل آف وائٹ میں تین منزلہ ہاؤس آف آسبورن کی تعمیر شروع ہوئی۔

یہی آسبورن اب تک وکٹوریا کی قیام گاہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاح آج تک اسے دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں ملکہ کے شب خوابی کے کمرے میں آج بھی ان لوگوں کی تصویریں آویزاں ہیں جنہیں ملکہ بہت چاہتی تھیں۔ ان ہی میں آگرے کے منشی حافظ محمد عبدالکریم کی تصویر بھی ہے۔

انقلابات کا سال

ملکہ کی چھبیسویں سال گرہ کے اگلے روز ان کی ہاں پانچواں بچہ پیدا ہوا۔ سارے بچے تومند تھے۔ وہ روز ماں کے ہاں حاضری دیتے، باپ ان کے ساتھ کھیلتے، کبھی ان کے لئے گھوڑا بنتے اور کبھی آسبورن کے بھوسے کے ڈھیر میں انہیں قلابازی کھانا سکھاتے۔

نئے، آرام دہ اور دلکش مکان میں سکھ چین کے دن گزر رہے تھے کہ فرانس سے خبر آئی کہ بادشاہت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے اور شاہی خاندان جان بچانے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ ابھی وکٹوریا کے دل کو پہلا دھڑکا لگا ہی تھا کہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کے تختے الٹے جانے کی خبریں آنے لگیں۔ اور تو اور خود برطانیہ میں غریب عوام کے حقوق مانگنے والوں کے تیور بدلنے لگے۔

اوپر سے غضب یہ ہوا کہ آئرلینڈ میں قیامت کا قحط پڑا۔ تین سال تک آلو کی فصل خراب ہوتی رہی۔ لوگ بھوکے مرنے لگے اور دوسرے علاقوں کی طرف بھاگنے لگے۔ سیاست داں ہر جگہ اور ہر زمانے کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، آئرلینڈ والے فرضی قحط کا ہنگامہ کھڑا کر رہے ہیں۔

عوامی چارٹر پیش کرنے والوں نے ایک روز اعلان کر دیا کہ ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء کو لندن کے کینگٹن کامن میں بہت بڑا جلسہ عام ہوگا جو بعد میں جلوس کی شکل اختیار کرے گا۔ سڑکوں پر آزادی یا موت کے نعرے لگنے لگے۔ فضا پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ملکہ کو دارالحکومت سے باہر بھیج دیا گیا۔

جلسے والے دن لندن ویران پڑا تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی ٹولیاں تھیں جو جلسہ گاہ کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ ایک گاڑی پر وہ عرض داشت رکھی گئی تھی جس پر پچاس لاکھ سے زیادہ لوگوں کے دستخط تھے اور جس میں لکھا تھا کہ روسا اور امراء اب ہوش کے ناخن لیں۔ حکام سہمے بیٹھے تھے کہ لندن کے چوراہوں پر کہیں کوئی انہیں پھانسی چڑھانے کی بات نہ چھیڑ دے۔

مگر ہوا یہ کہ جس جلسے میں لاکھوں لوگوں کے آنے کی توقع تھی اس میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ نہ آسکے اور وہ بھی لندن کی شدید بارش میں شائستہ نعرے لگا کر اور مہذب تقریریں کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ایسی ہی پریشانیوں کے دوران ملکہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ دبلی پتلی، نحیف و نزار۔ لیکن جلوس کا دن خیریت سے گزر جانے کے بعد ملکہ کا دل ٹھہرا۔ ان کو اپنا نیا مکان سارے محلوں اور قلعوں سے اچھا لگا۔

آگے چل کر اسی آسبورن میں خود ملکہ کی نگرانی میں وہ بڑا سا ہال بننے والا تھا جو دربار روم کہلایا اور جس کی شان و شوکت کا یہ حال تھا کہ راجاؤں مہاراجاؤں کے محل اس کے آگے شرماتے تھے۔ اس کا نقشہ رڈیارڈ کپلنگ کے والد، میو کالج آف آرٹس، لاہور کے پرنسپل اور لاہور کے عجائب گھر کے ناظم، جان لاک ووڈ کپلنگ Kipling نے تیار کیا تھا جس میں انہوں نے بھائی رام سنگھ کی مدد لی تھی جو ہندوستانی محلوں کی دیواروں پر پلاسٹر میں نہایت خوب صورت نقش ابھارنے کے ماہر تھے۔ چنانچہ ملکہ وکٹوریا کے دربار روم کی دیواروں پر ہسپانیہ کے کسی قصر جیسی بیلیں، گلاب، مور اور نقوش تراشے گئے۔ راہداریوں میں وی آنا کے مشہور مصور سوبودا Swoboda کے بنائے ہوئے ہندوستان کے مناظر لگائے گئے جنہیں بنانے کے لئے ملکہ نے انہیں خاص طور پر ہندوستان بھیجا تھا۔ ان ہی کے ساتھ ونٹر ہالٹر جیسے مصور کی بنائی ہوئی سر پرتاپ سنگھ اور مہاراجا دلیپ سنگھ کی شبیہیں آویزاں کی گئیں۔ وکٹوریا کے آخری دس برسوں کے دوران یہی دربار روم ضیافت گاہ کے کام آیا جس میں قیصر ہند، مادر یورپ، ملکہ وکٹوریا ہند سے آئے ہوئے ہیروں اور جواہرات میں لدی پھندی، اپنے خدمت گار غلام مصطفیٰ کا سہارا لئے داخل ہوتیں تو سارا ماحول جگمگا اٹھتا تھا۔

مگر ہیروں میں ہیرا تو وہ کوہ نور تھا جو یکم مئی ۱۸۵۱ء کی لندن کی عظیم نمائش میں رکھا گیا تو اس دیکھنے کے لئے ایک خلقت امڈ پڑی۔ اس نمائش کے لئے البرٹ نے اپنی نگرانی میں کرسٹل پیلس کی نمائش گاہ تعمیر کرائی تھی۔ نمائش میں ۳۴ ملکوں نے اپنی مصنوعات بھیجی تھیں۔

اس روز جب ملکہ نمائش کا افتتاح کرنے آئیں تو موسیقی اور سازینوں کے شور میں وہاں عطر کے فوارے چل رہے تھے اور دنیا کا کون سا عجوبہ تھا جو وہاں آراستہ نہ تھا۔ نمائش پانچ مہینے کھلی رہی۔ ملک بھر کے لوگ ریل گاڑیوں میں بھر بھر کر لندن پہنچے اور کوئی ساٹھ لاکھ لوگوں نے ایک ایک شلنگ دے کر یہ نمائش دیکھی۔

ادھر لندن کی علاقے سوہو اور ہے مارکیٹ میں جسموں کا کاروبار زوروں پر تھا۔ بجی دھجی عمارتوں میں دکانیں سجائے مہنگی طوائفیں بیٹھی تھیں تو سستی طوائفیں سڑکوں اور گلیوں میں گاہک ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ کچھ لوگ اس دھندے کے لئے اپنی بیٹیاں فروخت کر رہے تھے، کچھ قحبہ خانوں کے مالک سڑکوں سے لڑکیاں اٹھوا رہے تھے۔ تمام دولت مندوں کی طرح وکٹوریا بھی ان حالات سے بے خبر تھیں اور سیاست کی ساری ذمے داریاں البرٹ کو سونپ کر خود چین کی بنسی بجانا چاہتی تھیں۔ وہ اب بتیس برس کی ہو گئی تھیں اور اپنے سات بچوں میں مگن تھیں۔

البرٹ اپنے کام میں اس بری طرح جٹے کہ انہیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا۔ دنیا بھر سے سرکاری مراسلے آتے تھے جنہیں پڑھ کر انہیں ان پر احکام لکھنے ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صرف ۱۸۴۸ء محل میں بیس ہزار سے زیادہ مراسلے موصول ہوئے۔ اب ملکہ کو اپنے شوہر کی آنکھوں میں غم اور مایوسی صاف نظر آنے لگی تھی۔

دو سال پہلے پامرسٹن Palmerston وزیر خارجہ بنے۔ وہ بلا کے ذہین، جرات مند اور صاف گو انسان تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بادشاہ کے مطلق العنان ہونے کے دن گئے۔ ملکہ مشیر تو ہو سکتی ہیں، حکم نہیں چلا سکتیں۔ وہ کہتے تھے کہ بادشاہوں کی جا بے جا دخل اندازیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں اتنے تختے الٹے۔

وکٹوریا نے تو وزیر اعظم رسل Russell کو بلا کر کہہ دیا کہ انہیں یہ آدمی کہ جس کا نام پامرسٹن ہے، ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ البرٹ نے سوچنا شروع کیا کہ جو وزیر خارجہ ملکہ کو نظر انداز کر کے اپنے فیصلوں پر خود عمل درآمد کر لیتا ہے، اس سے نجات کیسے پائی جائے۔ انہوں نے یہ تک کہا کہ پامرسٹن بدمعاش ہیں۔ یہ ایک رات مسز برانڈ کے کمرے میں گھسے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ تو مسز برانڈ کی جرات اور چیخ و پکار کام آئی اور پامرسٹن اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل سے قاصر رہے ورنہ اس رات ایک عفیفہ کی حرمت پر داغ لگ گیا ہوتا۔

پامرسٹن کے بارے میں مشہور ہے کہ ادھر ادھر منہ مار لیا کرتے تھے۔ مگر اس رات کی حقیقت یہ تھی کہ بھولے سے کسی غلط کمرے میں چلے گئے اور جب مسز برانڈ چیخیں چلائیں تو وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔

وزیر اعظم نے ۱۸۵۱ء کے آخر میں پامرسٹن کو ہٹا دیا لیکن جلد ہی وہ دوبارہ اپنی وزارت پر متمکن ہو گئے اور وہ بھی اس شان سے کہ اس بار عوام میں ان کی مقبولیت اور بڑھ چکی تھی۔

اب وکٹوریا اور ان کے گھرانے پر برا وقت پڑنے والا تھا۔

ان کے ہاں آٹھویں بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ اس دوران کلوروفارم ایجاد ہو چکا تھا اور ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ملکہ کو بے ہوشی سنگھا کر بچہ پیدا کرایا جائے۔ اس میں تو بڑی کامیابی ہوئی اور بچہ کسی تکلیف کے بغیر ہو گیا لیکن اس بار کا بچہ صحت مند نہ تھا۔ وہ روتا رہتا تھا، کھاتا پیتا نہ تھا، اس کی نشوونما سست تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذرا سی خراش سے اس کے جسم پر نیل پڑ جاتے تھے۔ پھر پتہ چلا کہ اس کے خون میں نقص ہے اور خون اس مادے سے محروم ہے جو خون کو جمنے میں مدد دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ خون بہہ نکلے تو بچہ مر بھی سکتا ہے۔

ملکہ پر برہمی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر البرٹ سے جھگڑا کرتیں۔ ان پر چیختیں، گرجتیں اور وہ اٹھ کر کمرے سے جانے لگتے تو مشتعل ہو جاتیں اور ان کے پیچھے کمروں کمروں گھومتیں اور شور مچاتی جاتیں۔

غصے کو دباتے دباتے البرٹ کے چہرے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ وہ ۳۴ برس کے تھے لیکن اپنی عمر سے دس برس زیادہ نظر آتے تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک بار پھر عقل سے کام لیا اور اسکاٹ لینڈ میں بالمورل کے مقام پر جو زمین خریدی گئی تھی اس پر اپنے کنبے کے لئے ایک لق و دق عمارت کی تعمیر شروع کرا کے پورے خاندان کو اس میں مصروف کر لیا۔

ستر کمروں کی یہ قلعہ نما عمارت بن کر تیار ہوئی تو احساس ہوا کہ ہر طرف سر اٹھائے ہوئے پہاڑ، دور دور تک پھیلی ہوئی وادیاں، جگہ جگہ ابلتے چشمے، شور مچاتے جھرنے، لہلہاتے پھول، مہکتے ہوئے غنچے، گیت گاتے پرند، ہر طرف تتلیاں ہی تتلیاں، کہیں بچوں کے نقرئی قہقہے، کہیں گاؤں کی لڑکیوں کے نغمے، دن کی سنہری دھوپ، رات کی بے حد چمکدار چاندنی، کبھی بادلوں کا رقص، کہیں برف کے گالوں کی اڑان، کسی طرف درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوا اور کہیں بھیڑ بکریوں کا مسلسل لیکن کانوں کو بھلا لگنے والا شور۔ یہ سب دیکھ کر ملکہ تو بالمورل پر عاشق ہو گئیں۔ انہوں نے لکھا کہ اس کے بعد تو غیر شاعرانہ انگلینڈ سے خوف آنے لگا ہے۔

پورا کنبہ وہاں جا کر شاہی خاندان کی طرح نہیں بلکہ عام لوگوں کی طرح رہنے لگا۔ یہ سب مقامی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ملکہ غریب غربا کے گھروں میں چلی جاتیں اور ان کی خبر گیری کرتیں۔ وہ مقامی دیہاتی عورتوں سے بیٹھی دیر تک باتیں کرتیں اور البرٹ بارہ سنگھے کے شکار کو نکل جاتے۔

۱۸۵۳ء کی گرمیاں ختم ہوئی تھیں کہ ایک نیا طوفان شروع ہوا۔

ہر طرف شور اٹھا کہ روسی فوجیں ترکی اور اس کے سلطان کو ہڑپ کر جانے کے لئے چل پڑی ہیں اور آج ترکی تو کل باقی مغربی یورپ کی باری ہے۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور نعرے لگانے لگے کہ بے چارے ترکی کی مدد کے لئے فوراً فوج بھیجی جائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت بیشتر یورپی اقوام میں برطانیہ سب سے کمزور تھا۔ عوام کے مطالبے پر ملکہ خاموش رہیں، البرٹ نے بھی چپ سادھ لی۔ اب تو اخباروں نے لکھنا شروع کر دیا کہ چونکہ البرٹ جرمن ہیں، وہ ترکوں کے لئے کچھ نہیں کریں گے، اور یہ کہ برطانیہ پر حکمرانی کرنے یہ شخص کہاں سے آ گیا۔ پھر ایک روز یہ خبر پھیلی کہ البرٹ کا روسی جاسوس ہونا ثابت ہو گیا ہے، اور ملی بھگت کے جرم میں البرٹ اور وکٹوریا گرفتار کر کے قلعہ لندن میں قید کر دیئے گئے ہیں اور کسی بھی روز ان کے سر قلم ہونے والے ہیں۔ اس افواہ نے اتنا زور پکڑا کہ ایک روز تو اہل لندن شہر کے قلعے پر جمع ہو گئے تاکہ ملکہ اور ان کے شوہر کے سر قلم ہوتے ہوئے دیکھیں۔

فروری میں جب پارلیمان کا اجلاس شروع ہونے لگا اور ملکہ اور البرٹ دونوں اجلاس کا افتتاح کرنے شاہی جلوس کی شکل میں آئے تو وہی دیوانے لوگ ان کے استقبال کو نکل آئے۔ کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ برطانوی فوج ترکی کی مدد کو جانے والی ہے تو عوام اور اخباروں نے البرٹ کو معاف کرنے میں لمحہ بھر کی دیر نہیں لگائی۔

فوجیں کرائمیا کی جنگ لڑنے گئیں۔ خود ملکہ نے انہیں بڑے چاؤ سے رخصت کیا۔ لیکن ہوا یہ کہ روس کے محاذ پر یہ فوج روسیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ بھوک، غلاظت، بیماریوں، موسم کی سختیوں اور بد نظمی اور بد انتظامی کے ہاتھوں مرنے لگی۔ وقت گزرتا گیا، لڑائی طول کھینچتی گئی۔

کسی کے پیارے مرے، کسی کے دوست کام آئے۔ کتنے ہی گھر اجڑے، خود ملک کے اندر یتیموں اور بیواؤں کی فوج کھڑی ہو گئی۔ ملکہ نے اپنی جیب سے کچھ زخمیوں کی پنشن مقرر کر دی اور دستانے بُن کر محاذ پر بھیجے۔

ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ اوپر سے البرٹ کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ان کے ایک شانے میں گٹھیا ہو گئی اور پیٹ میں شدید درد رہنے لگا۔ شاہی خاندان کچھ وقت گزارنے پیرس گیا جہاں کی رنگینیوں کا سب سے زیادہ لطف بڑے بیٹے ہی نے اٹھایا اور اٹھانا بھی چاہئے تھا۔ وہ اب خیر سے ۱۴ برس کا ہو رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس کے لچھن اچھے نہیں۔

کرائمیا کے محاذ سے کوئی بھلی خبر نہیں آ رہی تھی۔ ان حالات سے گھبرا کر شاہی خاندان نے بالمورل کے پر فضا محل میں پناہ لے لی۔ وہاں بھی آزردگی نے پیچھا نہیں چھوڑا کہ ایک رات جب سب کھانا کھا کر سونے کی تیاری کر رہے تھے، پیغام رساں پہنچا اور یہ خبر لایا کہ برطانوی اور فرانسیسی فوج نے جنگ جیت لی ہے۔

البرٹ نے اعلان کیا کہ کچھ بھی ہو، اس فتح کا جشن ابھی اسی وقت منایا جائے گا۔ اب کیا تھا۔ سوئے ہوئے بچے جگائے گئے۔ پورا خاندان، سارے ملازم، تمام خادمائیں، آس پاس کے دیہاتی، غرض یہ کہ ایک غول کا غول سامنے والی پہاڑی پر چڑھ گیا اور ایک بہت بڑا الاؤ جلایا گیا۔ مرد گانے لگے، عورتیں ناچنے لگیں، بیگ پائپ بجنے لگے، بندوقیں داغی جانے لگیں اور شراب کے جام لنڈھائے جانے لگے۔ آخر یہ جم غفیر آدھی رات کو پہاڑی سے اترا اور مجمع دیر تک بالمورل کے جھروکے کے نیچے کھڑا فتح کے نعرے لگاتا رہا۔

نو مہینے بعد جب روس کے ساتھ پیرس کا معاہدۂ امن ہوا اور پھر جو لندن میں جشن منا گیا اسے دیکھنے کے لئے سارے ملک سے دس لاکھ آدمی آئے۔ پورے شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ آتش بازی آبشار کی طرح برسی اور ایک دل کش مقام پر بارہ ہزار فوارے لگائے گئے اور جھرنے بنائے گئے جنہیں ملکہ نے چلایا تو پوری فضا میں پھوہار موتی بن کر برسنے لگی۔

پھر واپس آنے والے فوجیوں کی پریڈ ہوئی۔ بحر اسود کی تپتی ہوئی دھوپ میں جھلسے ہوئے سپاہی جب قطار در قطار نکلے تو شدت جذبات سے لوگ رونے لگے۔ سینکڑوں فوجیوں کو تمغے دیے جانے تھے جو ملکہ نے اپنے ہاتھ سے دیے۔

ایک خصوصی تمغہ فلورنس نائٹ انگیل Nightingale کو دیا گیا جو نہایت مشکل حالت میں محاذ کی سیاہ راتوں میں چراغ اٹھائے ایک ایک مریض کے پاس جاتی اور نہ صرف مرہم پٹی کرتی بلکہ ان کے حوصلے بھی بڑھاتی۔ اسی کے بعد نرسنگ کے پیشے کو احترام نصیب ہوا۔

فتح کے جشن کے بعد ہر سال اگست کے معمول کے مطابق شاہی خاندان اسکاٹ لینڈ میں اپنے بالمورل کے محل میں چلا گیا۔ اس سال بارشیں ہو رہی تھیں، ہوائیں چل رہی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ جاڑے آگئے ہیں۔ ایسے حالات میں ملکہ وکٹوریا کے دماغ میں نہ جانے کیا سمائی اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ چونکہ یہ اگست کا مہینہ ہے اس لئے کسی آتش دان میں آگ نہیں جلے گی بلکہ تازہ ہوا کی خاطر کھڑکیاں کھلی رہیں گی۔

اگلی صبح ہونے سے پہلے پہلے ہر ایک نے چھینکنا شروع کر دیا۔

لوگوں نے لاکھ چاہا کہ ملکہ آگ جلانے کی اجازت دے دیں لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اب حالت یہ تھی کہ کھانے کی میز پر بچے، مہمان اور وزیر سب بیٹھے چھینک رہے ہیں۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور یخ بستہ ہوائیں سر اٹھائے بے دھڑک اندر چلی آ رہی ہیں۔

اوپر سے غضب یہ کہ ملکہ کا پیر ایک بار پھر بھاری تھا۔ وہ ڈاکٹر کی تنبیہ کی باوجود حاملہ ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ زچگی اعصابی تناؤ کا سبب بنے گی۔ اصل میں ڈاکٹر کو ملکہ کے بدن سے زیادہ ان کے دماغ کی فکر تھی۔ یہی ہوا کہ وہ بد دماغ ہو گئیں۔ البرٹ یہ صورت حال آٹھ مرتبہ جھیل چکے تھے۔ ملکہ ان پر چیختیں اور کھینچ کر مارنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنے لگتیں تو البرٹ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے اور ملکہ ان کا پیچھا کرتیں۔

ان کی سب سے بڑی بیٹی وکی کو اب سولہواں برس لگا تھا۔ باپ کی چہیتی بیٹی جتنی ہونہار تھی اتنی ہی بھولی اور پیاری بھی تھی۔ وکی نے اپنے والدین کی تمنا پوری کی اور پروشیا کے ولی عہد شاہزادے فریڈرک سے منگنی کر لی۔ وہ اگرچہ عمر میں نو سال بڑا تھا لیکن اپنی ہونے والی دلہن پر فریفتہ تھا۔ دونوں ایک ایک گھنٹہ ہاتھ میں ہاتھ تھامے باغ میں گھومتے اور اس زمانے میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ اکیلی نہیں جاتی تھیں بلکہ لڑکی کے ساتھ ایک نگراں کا ہونا ضروری تھا، یہ فرض خود ملکہ انجام دیتیں اور بیٹی کی خوشی دیکھ کر نہال ہوتیں۔ وہ یہ سوچ کر خوش تھیں کہ وکی ایک روز پروشیا کی ملکہ بنے گی۔

خود ملکہ اس بار ماں بننے میں دیر لگا رہی تھیں۔ ان کا بچہ مارچ میں ہونا تھا لیکن مارچ گیا، اپریل آ گیا۔ زچہ خانے کی ساری تیاریاں کبھی کی مکمل ہو چکی تھیں لیکن زچگی کے دردوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ آخر ۱۳ اپریل کی سہ پہر ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر دوڑے دوڑے آئے۔ البرٹ ان کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے اور اس سے پہلے کے تمام بچوں کی پیدائش کی طرح اس بار بھی ان کی ہمت بڑھاتے رہے اور اس مرتبہ بھی بار بار 'میری چھوٹی سی پیاری بیوی' کہتے رہے۔ دردِ زہ آ آ کر جاتا رہا لیکن ولادت کے کہیں آثار بھی نہ تھے۔

ہر ایک کو فکر ہوئی کہ کہیں بچہ مردہ نہ ہو، کہیں خود ملکہ کو کچھ نہ ہو جائے۔ ادھر ہرکارے تیار کھڑے تھے کہ کوئی خبر ہو تو جا کر کابینہ اور اخباروں کو مطلع کریں۔ لیکن اسی طرح دس گھنٹے گزر گئے۔ ملکہ ہلکان ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر بری طرح تھک چکے تھے۔

آخر رات دو بجے سے ذرا پہلے ملکہ وکٹوریا نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا۔ یہ خبر فوراً ہی پھیل گئی اور لندن کی توپوں نے اسی وقت ملکہ زادی کو سلامی دینی شروع کر دی۔ شہر والے جاگ اٹھے اور جشن شروع ہو گیا۔

اڑتیس سال کی عمر میں ملکہ نو بچوں کی ماں بن چکی تھیں، اور وہ سب کے سب زندہ تھے البتہ صرف ایک کی حالت دگرگوں تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ دگرگوں ان کی ازدواجی زندگی کی حالت تھی۔

ہندوستان میرا ہونا چاہئے

وکٹوریا اور البرٹ کے تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ البرٹ نے خود کو سرکاری کاموں میں مصروف کر لیا۔ وہ گھنٹوں کاغذات میں الجھے رہتے اور کھانے کے وقت وہیں بیٹھے بیٹھے دو چار لقمے کھا لیتے۔ انہوں نے ملکہ سے بھی ملنا چھوڑ دیا البتہ بچوں کے لئے وہ ضرور وقت نکالتے۔ وکٹوریا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سب ان ہی کے رویے کا نتیجہ ہے۔ ان کا دل کڑھتا، وہ کوشش کرتیں کہ سب ٹھیک ہو جائے لیکن آخر کار وہ ملکہ تھیں۔

وزیر اعظم سے لے کر محل کی خادماؤں تک ہر ایک البرٹ کے طور طریقوں کی تعریف کرتا۔ وزیر اعظم ڈزریلی نے کہا کہ میں نے ایسا تعلیم یافتہ شخص آج تک نہیں دیکھا۔ ملازماؤں کے ساتھ ان کا رویہ ایسا تھا کہ انہیں دیکھتے تو اپنا ہیٹ اتار کر انہیں سلام کرتے اور اگر وہ راستہ دینے کے لئے اپنا کام روکتیں تو کہتے کہ مجھے معاف کیجئے، میں نے آپ کو زحمت دی۔

میاں بیوی کی اس کشیدگی سے یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد ملکہ کے ہاں بچہ نہیں ہوا۔

البتہ جو بچہ آگے چل کر برطانیہ کے تخت پر بیٹھنے والا تھا اس کا یہ حال تھا کہ ماں اور باپ دونوں کے دل بیٹھے جاتے تھے۔ وہ غبی تھا، بد تمیز تھا، بے کہا تھا اور اس کی عقل موٹی تھی۔ اسے نہ تعلیم سے دلچسپی تھی نہ اچھی صحبت سے۔ برٹی کے لچھن دیکھ کر باپ نے اسے مہذب دوستوں کے ساتھ باہر بھیجا۔ وہاں اس نے نہ صرف شراب لنڈھائی بلکہ عورتوں سے بھی شوق کیا۔ یہ بات ماں باپ سے چھپائی گئی۔ برٹی بچپن ہی سے ایسا تھا۔ وہ اپنے استاد کو پتھر مارتا، کوئی اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا تو وہ اس پر تھوکتا اور اسے گالیاں دیتا۔ ضرورت سے زیادہ کھاتا اور گنجائش سے زیادہ شراب پیتا۔ باپ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ احمقوں کی صورت بنائے بیٹھا رہتا اور ظاہر کرتا کہ اس کی موٹی عقل میں کچھ نہیں سما رہا ہے۔ یہی برٹی، یہی پرنس آف ویلز آگے چل کر مملکت انگلیشیہ کا مالک و مختار بننے والا تھا۔ ملکہ کہا کرتیں کہ اس سے تو بڑی بیٹی وکی

لاکھ درجہ بہتر ہے، کاش وہی وارث تخت ہوتی۔ لیکن وہ تو بیاہ کر پروشیا جارہی تھی، اور ملکہ کو لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آنسو روکنے میں ناکامی ہو رہی تھی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب وکٹوریا کے انگلستان کی اقدار بدلنی شروع ہوئیں۔ عورتیں ایسا لباس پہننے لگیں جس سے بدن جھلکتا تھا۔ مرد کلبوں میں جاکر وہ سب کچھ کرنے لگے کہ ملکہ کا بس چلتا تو انہیں توپ دم کرا دیتیں۔ ملکہ کی یہی ادا ایک شخص کو اتنی بھائی تھی کہ جب وہ مرا تو خود غلاظت میں رہ کر اس نے ایک ایک پائی جوڑ کر جو ڈھائی لاکھ پاؤنڈ جمع کئے تھے وہ سب کے سب وہ ملکہ کے نام لکھ گیا۔ پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا لیکن جب چھان بین کی گئی تو پتہ چلا کہ اس نے اپنی وصیت میں واقعی یہی لکھا ہے۔ ملکہ نے یہ ترکہ بخوشی قبول کر لیا۔

لیکن وکٹوریہ کی ان اقدار کا اب چل چلاؤ تھا۔ لوگوں کا نہ صرف پہناوا اور چال چلن بدلا بلکہ اب انہوں نے انجیل مقدس کو داستان پارینہ کا نام دینا شروع کیا اور وہ سائنس دانوں کی بات سننے لگے۔ انسان زمین پر کیسے اترا، انہوں نے تسلیم کر لیا کہ جانور ارتقا کے مرحلوں سے گزر کر انسان بنا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں جرمنی میں انسان سے ملتی جلتی قدیم کھوپڑی دریافت ہوئی جس سے نتیجہ نکالا گیا کہ قدیم جانور اور جدید انسان کو جوڑنے والی زنجیر میں کوئی کڑی لاپتہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں لندن کے علاقے پکاڈلی میں ایک عورت کی نمائش شروع ہوئی جس کے پورے بدن پر بال تھے اور صورت بندر جیسی تھی۔ ہزاروں لوگ اسے دیکھنے گئے۔

وہی دن تھے جب ہر کام کی رفتار بڑھنی شروع ہوئی۔ گاڑیاں نہ صرف تیز رفتار ہوئیں بلکہ آپس میں ٹکرانے بھی لگیں۔ ہر آدمی ریل گاڑی میں بیٹھنے اور منزل پر جلد سے جلد پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسی زمانے میں معدے کی جلن اور سر کا درد دور کرنے کی دوائیں نکلیں۔

یوں لگتا تھا کہ انسان لپک رہا ہے اور تباہی کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کمپنیوں کے دیوالے نکلنے لگے، وقت بے وقت ہیضے کی وبا پھیلنے لگی۔ آبادی کے ساتھ ہی غریبی اور فاقے بڑھنے لگے۔ لندن کے پسماندہ علاقوں میں راتوں کو ٹھٹھرنے اور جاڑوں سے مرجانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے پاس رہنے کو گھر بھی نہیں تھے اور جو تابوت جیسے لکڑی کے بکسوں میں سوتے تھے۔ (آج ۲۰۰۰ء میں گتے کے ڈبوں میں سوتے ہیں)۔

انسان لپکا لیکن تباہی کو آنا تھا سو وہ آکر رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہندوستان میں آئی۔

فروری کا مہینہ تھا۔ ہندوستان سے آنے والی ڈاک میں پہلی بار اشارہ ملا کہ وہاں بھیانک بغاوت سر اٹھا رہی ہے۔ جولائی تک یہ خانہ جنگی پورے ہند میں پھیل رہی تھی اور ملکہ کو خوں ریزی اور مظالم کی داستانیں موصول ہو رہی تھیں۔ اس وقت ان کا وہی حال ہوا جو دس سال پہلے آئر لینڈ کے قحط اور فاقوں کی داستانیں سن کر ہوا تھا۔

وہ وزیر اعظم پامرسٹن کے پیچھے پڑ گئیں کہ وہ کوئی کارروائی کریں اور ہندوستان میں جاری خون خرابہ رکوائیں۔ ایک بار انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اگر حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھی ہوتیں تو ان کی کھال کھنچوا دیتیں، اس پر وزیر اعظم نے ہنس کر کہا کہ جن کی رائے سے آپ کو اختلاف ہے، یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ آپ پارلیمان کی رکن نہیں۔

معلوم ہوا کہ ہندوستانی سپاہی شدید اشتعال کے عالم میں دہلی پر یلغار کر رہے ہیں اور انگریز اپنی جانیں بچانے کے لئے جائے پناہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ہندوستان سے ڈاک بردار جہاز ہر دو ہفتے بعد آتا اور قتل و غارت گری کی نئی نئی خبریں لاتا۔

اگست تک ہندوستان سے خوں ریزی کی اور زیادہ بھیانک خبریں آنے لگیں۔ ملکہ نے کہا کہ کاش یہ خبریں غلط ہوں۔ مگر وہ صحیح تھیں۔ حکومت نے صرف اتنا کیا کہ ایک دن کے فاقے کا اعلان کیا۔ البتہ ملکہ نے اس سے اختلاف کیا اور مطالبہ کیا کہ فریقوں سے رحم کی درخواست کا دن منایا جائے۔ ان کی تجویز رد کر دی گئی۔

برطانیہ کے اخباروں میں ہندوستان سے آنے والے خط شائع ہونے لگے جن میں انگریز عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم کی ایسی تفصیل لکھی جاتی تھی کہ پوری قوم ہندوستانیوں سے نفرت کرنے لگی اور اس طرح کے مطالبے شروع ہو گئے کہ جب یہ غدار پکڑے جائیں تو کیوں کر ان کے منہ میں سور کا گوشت ٹھونسا جائے اور کس طرح ان کو توپوں کے دہانے پر باندھ کر گولا داغا جائے۔

ستمبر کے خاتمے تک پتہ چلا کہ برطانوی فوج کا پلہ بھاری ہو چلا ہے۔ ملکہ نے فوراً ہی صلح کی بات شروع کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ انتقامی کارروائیاں نہ کی جائیں اور بے دریغ پھانسیاں نہ دی جائیں۔

۱۴ دسمبر کی ایک ہندوستانی افسر کا خط آیا جس میں کانپور کے قتل عام کا حال لکھا تھا۔ خصوصاً انگریز عورتوں کے مارے جانے کی تفصیل درج تھی۔ اس پر وکٹوریا نے جو تبصرہ کیا وہ بحران کے وقت ان کے مخصوص صبر و تحمل کی ایک اور مثال تھا۔ انہوں نے لکھا۔ "عورت جس ظلم سے ڈرتی ہے، وہی اس پر ٹوٹا، وہ

تو قدرت نے ان پر ترس کھایا کہ سب کی سب مر گئیں۔ لیکن اس واقعے کی شہرت نہ ہونی چاہئے تھی، کیونکہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ مراسم ناخوش گوار ہوں گے "۔

وکٹوریا نے ہندوستان کے گورنر جنرل کی بیوی لیڈی کیننگ Canning کو لکھا کہ میں نہیں بتا سکتی کہ میں اس خوں ریزی کے تصور ہی سے کتنی مغموم ہوں جو ایک ایسے ملک میں ہو رہی ہے جو کتنا خوش حال معلوم ہوتا ہے اور جس سے، اور جس کے باشندوں سے مجھے اتنا زیادہ لگاؤ ہے۔

نومبر کے وسط میں خبر آئی کہ کمپنی بہادر کی وفادار فوجوں نے لکھنؤ کا محاصرہ توڑ دیا ہے اور دلّی واپس لے لیا ہے۔ لندن والوں نے فوراً ہی جشن منانا شروع کر دیا۔ لیکن اب ملکہ کو ہولناک انتقام کی خبریں مل رہی تھیں۔ باغیوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، یہ جان کر ان کا دل کڑھتا تھا۔ جب انگریزوں نے باغیوں کے جسم پر سور کی چربی ملی، ان کے حلق سے گوشت جبراً اتارا، ان کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلائیں، انہیں توپ دم کیا، درختوں پر یہاں سے وہاں تک لاشیں لٹکا دیں، شرفا کے منہ پر مجمع سے تھکوایا گیا، اور پورے پورے دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی تو وکٹوریا کو احساس ہوا کہ ظلم توڑنے کے معاملے میں انگریز تو باغیوں سے بھی بڑھ کر نکلے۔

ملکہ وکٹوریا کو بتایا گیا کہ ہندوستان سے آیا ہوا مہاراجا رنجیت سنگھ کا نوعمر بیٹا دلیپ سنگھ، جو ملکہ کو بے حد عزیز ہے، یہ خبریں سننے کے بعد اداس بیٹھا ہے اور انگریزوں پر جو ظلم ہوا ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں تو انہوں نے کہا کہ اس کی ایسی حالت نہیں کہ برطانوی فوج کی فتوحات پر مسرور ہو یا اس کے ہم وطنوں کو وحشی اور درندہ کہا جائے اور سینکڑوں ہزاروں کو پھانسی دی جائے تو وہ خوش ہو۔

اس وقت نہ صرف پورے برطانیہ میں بلکہ خود محل کے اندر ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ بھڑک رہی تھی۔ صرف ایک شخصیت تھی جو چند برس بعد ایسی ہی تعصب کی باتیں سن کر مشتعل ہوگی اور چیخے گی کہ کیا یہی ہے برطانوی انصاف؟

ملکہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ یہ سرکشی کارتوسوں پر سور کی چربی چڑھائے جانے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے یکسر مسترد کئے جانے کا اظہار ہے۔ چنانچہ ۲۳ نومبر کے روزنامچے میں ان کا تاریخی جملہ درج ہے۔ 'ہندوستان میرا ہونا چاہیے'۔

اسی کے بعد ہندوستان کی حکمرانی تاج برطانیہ کو سونپنے کے منصوبے بنائے گئے۔

اگست سنہ ۱۸۵۸ء میں کمپنی بہادر کی حکمرانی ختم ہوئی اور مملکت ہندوستان براہ راست ملکہ وکٹوریا کی عملداری میں شامل ہو گئی۔ اس موقع کی مناسبت سے کنزرویٹیو وزیر اعظم نے ایک شاہی فرمان کا مسودہ تیار کر کے ملکہ کو دیا۔ ملکہ نے اسے پڑھتے ہی کہا کہ اس میں تو سرد مہری محسوس ہوتی ہے اور یہ جذبات سے عاری دستاویز ہے اور یہ کہ اس کا لب ولہجہ تبلیغی ہے۔ تب وکٹوریا اور البرٹ نے بیٹھ کر اس میں کاٹ چھانٹ کی اور کچھ اس طرح کی بات لکھی گئی کہ ہم لاکھ مسیحی سہی مگر اپنا عقیدہ اپنی رعیت پر تھوپنا ہمیں منظور نہیں۔

پھر انہوں نے وزیر اعظم لارڈ ڈاربی کو لکھا کہ یہ ایک خاتون فرماں روا کے جذبات ہیں جو اپنے دل کی گہرائی سے کروڑوں مشرقی افراد سے مخاطب ہے۔

گندمی رنگت سے ان کا دیرینہ انس، ہندوستانی مہمانوں سے لئے ہوئے مشورے، انگریزوں پر ہونے والے مظالم کی داستانوں میں غضب کی مبالغہ آرائی اور یہ اطلاع کہ انگریز حکام ہندوستانیوں کو کلوٹا یا 'نگر' کہہ کر پکارتے ہیں، یہ سب ملکہ کے دل ودماغ میں طغیانی کی طرح امڈ رہا تھا۔

انہوں نے اعلان کیا: خانہ جنگی نے جو حال کیا، میں اس پر پشیمان ہوں۔ اب میں اپنی ہندوستانی رعایا کے بھلے کی خاطر کام کروں گی۔

وہ کیا جانتی تھیں کہ اس کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کے گلے میں تانبے کے وہ سکّے تعویذ کی طرح ڈالیں گی جن پر ملکہ وکٹوریا کی شبیہ بنی ہو گی۔

ملکہ وکٹوریا نہیں- ملکہ ٹوریا۔

مرد ہو تو ایسا

۱۸۶۱ء شاہی گھرانے کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ اس برس ملکہ کی ماں، بچپن کی ایک سہیلی، اور رشتے کے کئی بھائی بہن مرے۔ اور اب اس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ اس پر ٹوٹنے کو تھا۔

البرٹ میں شاید اب اور سختیاں جھیلنے کے سکت نہیں تھی۔ انہیں ٹائیفائڈ نے آن دبوچا۔ ان دنوں اس مرض کے ہر تیسرے مریض کا مرنا قریب قریب یقینی تھا۔ ڈاکٹروں نے وکٹوریا کو بتادیا کہ البرٹ کا حال اچھا نہیں۔ اب ملکہ کو احساس ہوا کہ ان کی زندگی کا سب سے اہم ستون گرنے کو ہے۔ انہوں نے رورو کر اپنا برا حال کر لیا۔ بچے باپ کے پاس آگئے اور ڈاکٹروں کو ناکام ہوتے دیکھتے رہے۔

۱۴ دسمبر کی رات البرٹ کی سانسیں بھاری ہونے لگیں۔ ملکہ ان کے چہرے پر جھکیں اور ایک آخری بوسا مانگا۔ البرٹ نے اپنے ٹھنڈے ہونٹ ملکہ کے رخسار سے مس کیے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں لیکن تھوڑی دیر بعد لوٹ آئیں اور البرٹ کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئیں۔ گیارہ بجے سے ذرا پہلے البرٹ نے چند گہری سانسیں لیں۔ وہی ان کی زندگی کی آخری سانسیں تھیں۔ لیکن وکٹوریا کا ہاتھ انہوں نے اس وقت بھی نہیں چھوڑا۔

لوگ ملکہ کو تھام کر برابر والے کمرے میں لے گئے۔ وہ روتی رہیں اور کہتی رہیں کہ اب مجھے وکٹوریا کہہ کر بلانے والا کوئی نہیں رہا۔ وہ ننھی سی بیٹی بیٹرس کے کمرے میں گئیں۔ وہ اپنے پالنے میں چین سے سو رہی تھی۔ ملکہ نے جھک کر اس کا منہ چوما۔ ایک ضعیف ملازمہ نے، جو البرٹ کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی تھی، بوڑھی ماں کی طرح وکٹوریا کو سہارا دیا اور لے جا کر ان کے بستر پر لٹا دیا۔ مگر نیند تو شاید آخری سانسیں لے چکی تھی۔

البرٹ کا تابوت بند کیا گیا تو اس میں چار بیٹیوں کے بالوں کی ایک ایک لٹ رکھی گئی۔ ایک لٹ خود وکٹوریا کے کھچڑی جیسے بالوں کی بھی رکھی گئی۔

ملکہ نے حکم دیا کہ البرٹ کا ذاتی کمرہ یوں رکھا جائے جیسے وہ ابھی زندہ ہیں۔ یہی ہوا۔ ہر رات ان کا شب خوابی کا لباس نکالا جاتا۔ صبح ان کے نہانے دھونے کا بندوبست کیا جاتا۔ اور تمام ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔

باپ کی موت کے چھ سات مہینے بعد چھوٹی بیٹی ایلس کی شادی ہوئی۔ ملکہ نے اس کا اہتمام کچھ یوں کیا کہ شادی پر جنازے کا گماں گزرتا تھا۔

ان تمام باتوں کا ولی عہد ملکہ زادے برٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور اس کے لچھن ویسے ہی رہے جنھوں نے، ملکہ کو یقین تھا، باپ کی جان لی ہے۔ ملکہ کا خیال تھا کہ اس کی شادی کی جائے تو شاید سدھر جائے۔ خوش قسمتی سے برٹی نے ڈنمارک کی شہزادی الیکزانڈرا کو شادی کی پیش کش کر دی جو اس نیک بخت نے قبول کر لی۔

وکٹوریا کو بیوہ ہوئے کوئی پندرہ ماہ گزر چکے تھے کہ برٹی کی شادی کا مرحلہ آ پہنچا۔ اس بار ملکہ نے پورے گھرانے کے بناؤ سنگھار کا اہتمام کیا، انتظامات اپنے ہاتھ میں لئے البتہ طرح طرح کی فکریں انہیں ہر لمحہ ستاتی رہیں، مثلاً چھوٹی بیٹی ایلس امید سے تھی اور یہ اس کے پورے دن تھے۔ ملکہ کو فکر تھی کہ کہیں عین شادی کی تقریب کے وقت درد نہ شروع ہو جائیں۔

ونڈسر کے کلیسا میں جب شادی کی رسوم شروع ہوئیں تو ملکہ ایسی جگہ بیٹھیں جہاں کوئی انہیں دیکھ نہ سکے۔ انہیں ڈر تھا کہ البرٹ کی یادوں نے ازدحام کیا اور آنسو نہ تھمے تو لوگ کیا کہیں گے۔ کوئی کیا کہتا؟۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی ایلس کے درد شروع ہو گئے۔ کسی نے کچھ کہا؟۔

ہاں، اس وقت بہت کچھ کہا جب ملکہ کو گھوڑے پر بٹھا کر سیر کرانے والے اسکاٹ لینڈ کے سائیس جان براؤن نے ملکہ کو بانہوں میں لے کر گھوڑے سے اتارنا شروع کیا۔

براؤن کو البرٹ نے مرنے سے تین سال پہلے ملازم رکھا تھا۔ وہ تندرست و توانا تھا، سخت محنتی اور جفاکش تھا۔ خوش شکل اور ذہین تھا، اس کے بازو مضبوط اور ٹانگیں لمبی تھیں، ڈاڑھی اور سر کے بال گھنگریالے تھے اور چہرے پر نہایت موزوں ٹھوڑی تھی۔ یہی وکٹوریا کی بڑی کمزوری تھی کیونکہ خود ان کی اور کئی بچوں کی ٹھوڑیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

۱۸۶۳ء سے ملکہ کے روزنامچوں میں براؤن کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ان کی گھوڑا گاڑیوں کے کئی حادثے ہوئے اور ہر بار جان براؤن نے جان کی بازی لگا کر ان کی جان بچائی۔ ایک حادثے میں تو ملکہ کی آنکھ

کے گرد سیاہ حلقہ بن گیا اور ہاتھ کا ایک انگوٹھا ہمیشہ کے لئے ٹیڑھا ہو گیا۔ لیکن جان سلامت رہی۔ ملکہ جرمنی گئیں تو گھوڑے کی باگ تھامنے کے لئے براؤن کو ساتھ لے گئیں۔ وہ ملکہ کو ایسے سنبھالتا جیسے وہ چھوٹی سے بچی ہوں۔ وہ خود یوں پیش آتا جیسے اسکاٹ لینڈ کے کسی دور دراز گاؤں سے آیا ہوا اجڈ دیہاتی ہو۔ ملکہ کو اس نے کبھی ملکہ نہیں کہا۔ لوگوں نے کئی بار سنا، وہ ملکہ کو مخصوص اسکاٹش لہجے میں 'دومن' کہتا تھا، اور ملکہ اس کے بھولپن پر صدقے واری ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار اس نے وکٹوریا کی چھوٹی سی ٹھوڑی کو ہاتھ سے اونچا کرتے ہوئے کہا 'کیا اپنا سر اونچا نہیں رکھ سکتیں؟'

یہ سب ان ہی دنوں ہوتا تھا جب ملکہ اسکاٹ لینڈ جاتیں۔ اس وقت ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔

اکتوبر ۱۸۶۴ء میں وکٹوریا، ان کے ذاتی معالج اور داروغہ امور خانہ داری، سر چارلس فپسPhipps نے مل کر سوچا کہ کیوں نہ سردیوں میں جان براؤن کو اوسبورن بلا لیا جائے تاکہ ملکہ کی زندگی میں خوشی آئے۔ شہزادی ایلس نے خوش ہو کر اس تجویز کی تائید کی۔ دسمبر میں صورت یہ تھی کہ ملکہ اپنی پستہ قد گھوڑی فلورا پر سوار تھیں اور اور جان براؤن آگے آگے باگ تھامے چل رہا تھا۔

بمشکل دو مہینے گزرے تھے کہ ملکہ نے اپنی ڈائری میں لکھا "میں نے طے کیا ہے کہ اب براؤن مستقل طور پر یہیں رہے گا اور گھوڑے کی باگ تھامنے کے علاوہ دوسرے کام بھی کرے گا کیونکہ اب ایسے قابل اعتبار لوگ کہاں ملتے ہیں"۔

اور دو مہینے بعد جان براؤن کا منصب بڑھا دیا گیا۔ اب وہ باگ بردار نہیں بلکہ ملکہ کا 'ہائی لینڈ سرونٹ" قرار دے دیا گیا۔ اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہ کرنا ہے، اس قسم کے احکام صادر کرنے کا اختیار صرف ملکہ کو حاصل تھا۔ وہ اب محل کے باہر ہی نہیں، اندر بھی ملکہ کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ اسے ملکہ کے بوٹ صاف کرنے کے فرض سے فارغ کر دیا گیا۔ ملکہ نے اسے بالمورل میں محل کے احاطے کے اندر ایک کاٹیج دینے کا وعدہ بھی کر لیا۔ اس کی تنخواہ ۱۲۰ پاؤنڈ سے بڑھا کر ۳۱۰ پاؤنڈ کر دی گئی اور بالآخر اسے 'اسکوئر' کا منصب عطا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی 'جان براؤن اسکوئر' کو ملکہ کا فرمان ملا جس میں لکھا تھا کہ آپ کی تنخواہ چار سو پاؤنڈ کی جاتی ہے کیونکہ ہمیں ایسا وفا شعار ملازم آج تک نہیں ملا جس نے ایک دن کی بھی چھٹی نہ لی ہو اور جو ایک لمحے کو بھی غیر حاضر نہ رہا ہو۔ "فقط آپ کی مخلص دوست۔ وکٹوریا"۔

انہوں نے لکھا۔ "محل میں ایسا مرد ایک بھی نہیں"۔

براؤن کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ وکٹوریا کی صحت دیکھتے دیکھتے اچھی ہو گئی۔ انہوں نے کلیسا کے ڈین ویلز لے سے کہا کہ شوہر کا غم کم ہوتا جارہا ہے، کیا یہ مقام استغفار ہے؟ ڈین نے کہا کہ خدا اگر کوئی خوشی عطا کرے اور اس سے انکار کیا جائے تب توبہ کرنی چاہئے۔

ایک اور پادری نے اعتراض کیا تو ملکہ نے کہا کہ مجھے ایک مرد کی ضرورت ہے، مشین کی نہیں۔ مجھے ایسا مرد درکار ہے جو میرا سہارا بنے، شوہر نہیں۔

مگر لوگ کہاں مانتے ہیں، ہر طرف یہ خبر گرم ہوئی کہ ملکہ نے شادی کرلی ہے۔ لوگ انہیں مسز براؤن کہنے لگے۔ کسی نے کہا کہ ملکہ ماں بننے والی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی وکٹوریا کا عوام کے سامنے آنا کم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ ان کا پیٹ بڑھا ہوا ہے۔ ایک بار ملکہ نے پریڈ کے معائنے کے لئے لندن کی ہائیڈ پارک آنے پر رضامندی ظاہر کی اور ان کے وزیروں نے کہا کہ جان براؤن کو ساتھ نہ لائیں۔ ملکہ آگ بگولا ہو گئیں۔

اخبار رسالے ان کا مذاق اڑانے لگے۔ محفلوں میں ان کے لطیفے سنائے جانے لگے۔ ادھر ملکہ اپنے بھولپن میں اس آگ کو ہوا دیئے جا رہی تھیں۔ ایک بار جان براؤن نے کہا کہ تمباکو نوشی کے کمرے میں لوگ رات بھر تمباکو پھونکتے ہیں اور میرے لئے سونا دشوار ہو جاتا ہے۔ ملکہ نے اگلے ہی روز حکم جاری کیا کہ تمباکو نوشی کے کمرے میں خبردار جو رات بارہ بجے کے بعد کسی نے قدم بھی رکھا۔

ملکہ کے مشیروں وزیروں نے بہت چاہا کہ وہ براؤن کو چھوڑ دیں۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ محبت اور عداوت کے معاملے میں ملکہ کسی کی ایک نہیں سنتیں۔

ایک بار ملکہ نے اپنی تصویر کشی کی میز کے بارے میں شکایت کی تو براؤن نے سختی سے کہا کہ اسی سے کام چلاؤ، میں تمہارے لئے نئی میز نہیں بنا سکتا۔ ایک روز ملکہ نے کوئی بے ڈھب سا لباس پہن لیا۔ براؤن نے کہا کہ یہ کیا پہن رکھا ہے؟ ان ہی دنوں ملکہ نے اپنی ایک بیٹی کو لکھا کہ میں نے ایسا کھرا، ایسا ہمدرد، ایسا وفادار، اور ایسا دکھوں میں ہاتھ بٹانے والا شخص آج تک نہیں دیکھا۔ "خدا ہی جانتا ہے کہ میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ کوئی میری دیکھ بھال کرے"۔ سو وہ کرتا تھا۔ وہ گھوڑے کی باگ تھام کر چلتا، ملکہ اپنی گھوڑا گاڑی میں سواری کرتیں تو وہ کوچوان کے برابر بیٹھتا، وہ کام کرتیں تو براؤن قریب کھڑا رہتا اور دوسروں کو مداخلت سے باز رکھتا، ملکہ کے پیغامات لے جاتا، انہیں شال اڑھاتا، اور وہ زیادہ کام کرتیں تو سختی سے منع کرتا۔ وہ ملکہ کے ساتھ اسی طرح پیش آتا جیسے وہ اپنی ماں یا اپنی بیوی کے ساتھ آتا۔

ایک بات طے ہے۔ ان دونوں کا رشتہ اور تعلق بھی اَور چیزوں کی طرح کھرا تھا۔ وکٹوریا کو اگر ایک شوہر درکار ہوتا تو ان کے مذاق کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ جان براؤن نہ ہوتا، کوئی اور ہوتا۔

اسی زمانے میں شاعر ٹینیسن Tennyson وکٹوریا سے ملنے گئے۔ بعد میں انہوں نے لکھا۔ "ان میں ایک ایسی شاہانہ معصومیت ہے جو کسی اور عورت میں نہیں۔"

اپنے اور جان براؤن کے بارے میں افواہیں سن کر ملکہ کو دکھ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ لوگ مجھے جانتے نہیں۔ انہوں نے اپنا ذہن کھول کر رکھ دینے کا فیصلہ کیا اور اسکاٹ لینڈ میں قیام کے دوران جو یادداشتیں لکھی تھیں انہیں مرتب کرا کے شائع کرا دیا۔

کتاب شائع ہوتے ہی اس کی دھوم مچ گئی۔ پہلے چار مہینوں میں اس کے اسّی ہزار نسخے فروخت ہوئے اور ابھی اَور کا مطالبہ ہو رہا تھا۔

کچھ عرصے بعد اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوگا، یہ ہندوستان میں شائع ہوگی اور اس کا ایک خصوصی نسخہ خود ملکہ کے لئے انگلستان بھیجا جائے گا۔

ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ اس اردو کتاب کے بعد اردو زبان کا ایک اتالیق بھی اکبر آباد سے لندن آئے گا۔

ابھی کوئی نہیں جانتا کہ اس کے آنے سے محل میں کیسا طوفان اٹھے گا۔

سورج نے غروب ہونا چھوڑ دیا

ملکہ کا بیوہ ہونا غضب ہو گیا۔ انہوں نے بے تحاشا کھانا شروع کر دیا۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ وہ اور زیادہ موٹی ہو گئیں۔ ان کی گردن کی جلد جگہ جگہ سے لٹک گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی آنکھیں سرخ رہنے لگیں۔ ملکہ کے ذاتی معالج کو فکر ہوئی۔ یہ تو شاہی خاندان میں پاگل پن کی نشانی تھی۔

وہ چپ چپ رہنے لگیں۔ ان کو تنہائی اچھی لگنے لگی۔ وہ دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی رہتیں جہاں دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر لگی تھی جس میں وہ اپنے شوہر کر ساتھ بیٹھی تھیں اور ان کے قدموں میں سارے بچے کھیل رہے تھے۔ اکثر اوقات ان کی کوئی خادمہ انہیں شاعری یا ناول پڑھ کر سناتی۔ شعر سننا ان کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔

۱۸۷۰ء میں پروشیا اور فرانس کی جنگ ہوئی۔ فرانس کے شاہ نپولین سوئم کو شکست ہوئی اور وہ اپنے ہزاروں فوجیوں سمیت جنگی قیدی بنے۔ یوں لگا کہ جرمنی اب پورے یورپ پر غالب آجائے گا۔

۱۸۷۱ء شروع ہوا تو وکٹوریا نے دعا مانگی کہ خدا خیر کرے، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ولی عہد شہزادہ برٹی کی تیسویں سالگرہ کا جشن ختم ہی ہوا تھا کہ اس پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہوا۔ بالکل ویسا ہی جیسا اس کے باپ پر ہوا تھا۔ اسے تیز بخار ہوا، سانس لینے میں دشواری شروع ہوئی اور بے چینی کے عالم میں وہ کبھی اس کمرے میں جاتا کبھی اُس کمرے میں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کی حالت تو البرٹ سے بدتر ہے۔

ملکہ کی اپنی حالت ٹھیک نہ تھی۔ ان کی ایک ٹانگ میں گٹھیا کہ تکلیف شروع ہو گئی اور چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا۔ پھر ہر طرح کی بیماریوں نے ان کا گھر دیکھ لیا۔ آخر وہ بستر سے لگ گئیں اور ان کا کھانا پینا ہی نہیں، ان کا ڈائری لکھنا تک چھوٹ گیا۔

جب وہ بیٹے کو دیکھنے گئیں تو اندھیرے کمرے میں وہ بستر علالت پر لیٹا تھا۔ صرف ایک لیمپ روشن تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر اور دو نرسیں موجود تھیں اور بیوی جو شوہر کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی غم کی تصویر نظر آتی تھی۔ وکٹوریا کو اپنے شوہر کا مرنا یاد آگیا۔ برٹی کے چھوٹے چھوٹے پانچ بچوں کے سروں پر یتیمی کا سایہ منڈلانے لگا۔

ملکہ گھبرا کر واپس ونڈسر چلی گئیں۔ وہاں ایک صبح تار آیا کہ برٹی کی حالت نازک ہے۔ برفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور موسم کے تیور خراب تھے۔ ایسی حالت میں شاہی خاندان کے افراد برٹی کو دیکھنے پہنچے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ایک ایک شخص کمرے میں آئے اور پردے کے پیچھے سے مریض کو دیکھے جس کی ہر سانس پر آخری کا گماں ہوتا تھا۔

اگلی صبح ملکہ کو سوتے سے جگایا گیا کہ بیٹے کا چل چلاؤ قریب ہے۔ ملکہ دوڑی ہوئی گئیں اور دیکھا کہ برٹی کی سانس رکنے کو ہے۔ اچانک اس کی سانس ذرا آسانی سے آنے جانے لگی۔ شاید یہ آخری سنبھالا تھا۔

دنیا بھر میں خبر پھیل گئی کہ وکٹوریا کا بڑا بیٹا دم توڑ رہا ہے۔ ٹیلی گرام ایجاد ہو چکا تھا۔ اچانک ہر جانب سے تار آنے شروع ہوئے۔ سب میں ولی عہد کی صحت کی دعائیں تھیں۔ ہندوستان سے بھی تار آئے۔ معلوم ہوا کہ مسجدوں اور مندروں میں شہزادے کی صحت یابی کی دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔

برٹی پر غشی سی طاری تھی۔ وہ کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ تکلیف کے مارے اس نے اپنا کمبل کس کر پکڑ رکھا تھا اور اس کا معدہ اب غذا قبول نہیں کر رہا تھا۔

چوری چھپے تدفین کی تیاری شروع ہو گئی۔ یوں بھی دسمبر کی ۱۴ تاریخ، یعنی البرٹ کی برسی قریب تھی۔

پھر عجب واقعہ ہوا۔ ۱۴ تاریخ کی صبح ڈاکٹروں نے خبر دی کہ برٹی کی حالت سنبھل رہی ہے، بخار کم ہوا ہے، وہ آرام سے سویا ہے اور کچھ غذا بھی حلق سے اتری ہے۔ اہل خاندان نے دو چار روز انتظار کیا اور جب مرض میں افاقہ دیکھا تو لوگ خوشی سے رو پڑے۔ ملکہ نے کرسمس منانے کی تیاری شروع کر دی اور کرسمس کے دن برٹی نے اپنے بستر ہی سے اہل خانہ کے نام مبارک باد کا پیغام جاری کیا۔

دنیا بھر سے تار اب بھی آ رہے تھے لیکن اب کے سارے کے سارے مبارک باد کے تھے۔

لندن کی سڑکوں پر لوگ گانے لگے: خدا پرنس آف ویلز پر کرم کرے۔

ملکہ نے لکھا۔ "خدا نے برٹی کی جان بخشی ہے تاکہ وہ نئی زندگی گزار سکے۔ لیکن اگر اس نے خدا

کے اس اختباہ پر کان نہ دھرا اور اگر پوری قوم کی حیرت انگیز ہمدردی اور محبت نے اس کی شخصیت کو تبدیل نہ کیا تو یہ پہلے سے بھی بدتر ہوگا اور یہی اس کی تباہی ہوگی"۔

۱۸۷۴ء میں ڈزریلی کی حکومت بنی۔ نہر سویز مکمل چکی تھی اور بڑی حد تک حاکم مصر ہی اس کا مالک تھا۔ وہ غریب قرض کے بوجھ تلے دبا تو وزیر اعظم ڈزریلی نے اس سے نہر کے باقی ماندہ حصص کا تقریباً آدھا حصہ خرید لیا۔ اب یہ نہر برطانیہ کی تھی اور اس کے پار کی زمینیں برطانیہ کی دسترس میں تھیں۔ اس کے بعد ہی یہ ہوا کہ مملکت برطانیہ میں سورج نے غروب ہونا چھوڑ دیا۔

پوری قوم پر سرشاری کا عالم تھا۔ برطانوی صنعت کار خوش تھے کہ ان کے مال کی منڈی پھیلتی جارہی ہے۔ اسی خوشی کی کیفیت میں ولی عہد پرنس آف ویلز نے ماں سے ہندوستان کے سفر کی اجازت لے لی۔

برٹی کے دوستوں سے لدا پھندا شاہی جہاز ۱۸۷۵ء کے آخر میں ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ اس کا ساحلِ ہند پر لنگر انداز ہونا تھا کہ چہار جانب ان کی مقبولیت کے ڈنکے بجنے لگے۔ آخر اسی سرزمین کے باشندوں کی دعاؤں نے انہیں نئی زندگی عطا کی تھی۔ انہوں نے وہاں ہاتھی اور شیر مارے، راجوں مہاراجوں کے دل موہ لئے، بچوں کے میلوں میں شرکت کی، مدبرانہ تقریریں کیں لیکن ہیرا پھیری سے نہیں گئے اور ہر طرح کی عورتوں کی صحبت کا لطف بھی اٹھا ہی لیا۔

اب جوان کا جہاز ہند سے واپس انگلستان آیا تو وہ ماں کے لئے تحفوں سے لدا پھندا تھا۔ ان تحفوں میں ملکہ وکٹوریا کی اسکاٹ لینڈ کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب کا اردو ترجمہ بھی تھا جو ہندوستان میں شائع ہوا تھا اور جس پر ملکہ کے لئے خاص طور پر جلد باندھی گئی تھی جس کے نقوش میں سنگِ مرمر کے گل بوٹے بٹھائے گئے تھے۔ ملکہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ مارے سرشاری کے انہوں نے پورے خاندان کے لئے بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا جس میں شہزادے کو بتایا گیا کہ برطانوی پارلیمان نے شاہی القاب کا مسودۂ قانون منظور کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پارلیمان نے ناکوں چنے چبوائے تب کہیں وہ قانون منظور کیا جس کے تحت ملکہ کو شاہنشاہ قرار دیا جانا تھا۔ ارکان پارلیمان چاہتے تھے کہ ملکہ کو صرف ہندوستان کی حد تک شہنشاہ سمجھا جائے۔

یومِ مئی، ۱۸۷۶ء کو وکٹوریا کے بارے میں اعلان ہوا کہ آج سے وہ ملکہ ہونے کے ساتھ ساتھ شہنشاہ بھی ہیں۔ ملکہ نے خود اپنے نام کے ساتھ 'ملکہ اور شہنشاہ' لکھنا شروع کر دیا۔

دلّی میں بڑا دربار ہوا جس میں ملک بھر کے رؤسا اور امرا ایسے ٹھاٹ باٹ سے اور آن بان کے ساتھ آئے جیسے خود ملکہ وہاں موجود ہوں۔ لیکن ان کی غیر موجودگی میں سارے مجمع نے انہیں 'شاہنشاہ پادشاہ' قرار دیا۔

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ نے قصر ونڈسر میں اپنے نئے خطاب کی خوشی میں بے حد شاندار ضیافت دی۔ اس موقع پر شہزادہ آرتھر نے پہلی بار 'قیصر ہند' کے نام سے جام تجویز کیا۔ جو حق میں تھے خوش ہوئے، جو مخالف تھے وہ سارے کے سارے خاموشی سے پی گئے۔

اس رات ملکہ نے سر سے پاؤں تک ہندوستانی ہیرے جواہرات پہن رکھے تھے۔ اسٹار آف انڈیا سمیت وہ سب جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس جتنے بھی ہندوستانی زیورات تھے آج کی رات آپ نے وہ سارے کے سارے پہن ڈالے ہیں۔ ملکہ بولیں۔ "ارے نہیں۔ میں باقی بھی ابھی منگاتی ہوں"۔ اس کے بعد ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تین تھال اور لائے گئے۔ ایک لارڈ نے آہستہ سے کہا کہ ایک چھوٹی سے عورت کے بجائے یہ چمک دمک کسی دراز قد سانولی خاتون پر زیادہ زیب دیتی۔

ان ہی دنوں خبریں آئیں کہ ترکی کی مسلمان فوجیں بلغاریہ کے مسیحیوں پر مظالم ڈھا رہی ہیں۔ یہ خبریں سن کر انگلستان والوں کا خون کھول رہا تھا۔ وہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ کوئی اٹھے اور ترک سلطان کی خبر لے۔

مسیحی مغرب ترکوں کا مخالف ہوا تو صاف ظاہر تھا کہ روس اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھائے گا۔ ترکی پر تو اس کی نظریں پہلے سے لگی ہوئی تھیں، اب اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ چاہئے تھا وہ بلغاریہ کے مسیحیوں نے فراہم کر دیا۔ انہوں نے روس سے مدد مانگ لی۔ شاہ روس کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اپریل ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس پر برطانوی حزبِ اختلاف کے رہنما گلیڈسٹن خوشی سے جھوم اٹھے، وزیر اعظم ڈزریلی فکر میں ڈوب گئے اور ملکہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے تو وزیر اعظم کے نام ان کے پیغامات کا تانتا بندھ گیا جن کا متن ایک ہی تھا۔ "اس سے پہلے کہ وہ ترک فوج کو تباہ کریں اور قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑیں، ان ہولناک، چالباز، بے رحم روسیوں کے خلاف جرات مندی سے کارروائی کی جائے"۔

ملکہ پر ایسا جوش طاری ہوا کہ ان کا اعصابی تناؤ جاتا رہا اور دوسری تکلیفیں رفع ہو گئیں۔ بوڑھے اور بیمار وزیرِ اعظم نے ملکہ کا جو یہ حال دیکھا تو خود کو سنبھالا کہ کہیں شاہی جلال حالات کو الجھا نہ دے۔ آخر انہوں نے اپنی کابینہ سے یہ منوالیا کہ اگر روسیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو برطانیہ اعلان جنگ کر دے گا۔

اُدھر روس اپنی من مانی کرتا رہا، اِدھر وکٹوریا کے پیچ و تاب میں ذرا سی کمی نہ آئی یہاں تک کہ ایک بار انہوں نے تخت چھوڑ دینے کی دھمکی بھی دی۔ انڈین سکریٹری کی بیوی، لیڈی سالسبری نے لکھا کہ ملکہ اب اپنے قابو میں نہیں۔ وہ بے حد برہم ہیں اور اپنے وزیروں کے پیچھے پڑی ہیں کہ جا کر جنگ کریں۔ ایک بار ملکہ نے کہا کہ کاش میں مرد ہوتی، میں خود جا کر ان بھیانک روسیوں کو مار لگاتی۔

حزب اختلاف کے قائد نے کہا کہ قیصرِ ہند کا خطاب پا کر ملکہ آپے سے باہر ہو گئی ہیں۔ ملکہ نے کہا کہ قائد حزب اختلاف نیم پاگل ہیں۔ وزیرِ اعظم نے اپنی خیر منائی اور برطانوی بحریہ ترک ساحلوں پر بھیج دی۔

آٹھ نو مہینے بعد روس عارضی صلح پر رضامند ہو گیا۔ برلن میں امن کے مذاکرات ہوئے اور روس کے مزاج ٹھکانے آئے۔ وزیرِ اعظم نے خدا کا شکر ادا کیا، ملکہ نے انہیں اعلیٰ اعزاز سے نوازا، قائد حزب اختلاف کڑوا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

ملکہ وکٹوریا اب ساٹھ برس کی ہو رہی تھیں۔ پچاس کے مقابلے میں اب ان کی صحت کہیں بہتر تھی۔ ان کے بچوں اور بچوں کے بچوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ "بالکل ویسے جیسے ونڈسر پارک میں خرگوشوں کے بچے"۔

۱۸۷۸ء میں ان کے ستائیس پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہو چکی تھیں اور ایک پرنواسی پیدا ہونے کو تھی۔ ہر پوتے اور نواسے کے نام میں البرٹ اور ہر پوتی اور نواسی کے نام میں وکٹوریا کا نام ضرور شامل ہوتا تھا۔

اسی دوران ملکہ کی چہیتی بیٹی ایلس مر گئی۔ وکٹوریا دیر تک روئیں۔ لیکن چند روز بعد ہی وہ اپنے معمولات میں مصروف ہو گئیں۔

ملکہ اب صدمے سہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔

اک چراغ اَور بُجھا

ملکہ وکٹوریا کو سفر کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑے اشتیاق سے فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی جاتیں اور اس خیال سے کہ ملکہ کو دیکھ کر لوگوں کا مجمع نہ ہو جائے، وہ بھیس بدل کی گھومنے نکلتیں۔ لیکن چائے کے پیکٹوں سے ڈاک کے ٹکٹوں تک ہر جگہ ان کی تصویریں اتنی کثرت سے چھپتی تھیں کہ لوگ انہیں پہچان لیتے اور ہر مقام پر ان کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔

اس سفر کے شوق کی خاطر ملکہ نے نئے زمانے کی ایجاد یعنی ریل گاڑی کو تو قبول کر لیا تھا اور ان کے لئے ٹرین کے شاہی ڈبے بنائے گئے تھے، لیکن اپنی بلا کی قدامت پسندی کی وجہ سے انہوں نے سائنس کی دوسری ایجادوں کا محل میں داخلہ بند کر رکھا تھا۔ مثال کے طور پر انہیں بجلی کے بلب ناپسند تھے اور وہ شمع اور لمپ زیادہ پسند کرتی تھیں۔ ریمنگٹن کے ٹائپ رائٹر دستیاب تھے لیکن انہیں ہاتھ کی لکھائی عزیز تھی۔ الیگزانڈر گراہم بیل اپنی ایجاد، یعنی ٹیلی فون کا مظاہرہ کرنے خود محل میں آئے، ملکہ نے کان سے لگا کر سنا بھی لیکن بولیں کہ آواز بہت دھیمی ہے۔ اسی طرح ایڈیسن کے گراموفون کا محل میں گزر تک نہیں تھا۔ جب ریکارڈ میں آواز بھرنا آسان ہو گیا تو ایک ریکارڈنگ مشین محل میں لائی گئی جس میں پہلے ملکہ کی ملازماؤں نے اپنے کھلکھلانے کی آوازیں بھریں اس کے بعد خود ملکہ سلامت نے اپنی آواز ریکارڈ کرائی جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ کسی نوعمر لڑکی کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ آواز پھر کبھی کوئی نہ سن سکا کیونکہ ملکہ نے اپنا وہ ریکارڈ اٹھا کر کسی غیر ملکی مہمان کو تحفے میں دے دیا جس نے اسے ادھر اُدھر ڈال دیا۔

ملکہ پرانی چیزوں کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ یہ سب ٹھیک تو ہیں، پھر یہ نئی نئی بلائیں گھر میں لانے کی کیا مار پڑی ہے۔

ملکہ اب خود ستر کے پیٹے میں تھیں اور اچھی بھلی توانا تھیں لیکن دوسروں کا چل چلاؤ لگا ہوا تھا۔ ڈزریلی بوڑھے اور کمزور ہو کر کھانستے کھانستے مر گئے البتہ وصیت کر گئے کہ ان کے تابوت میں وکٹوریا کی ایک

تصویر ضرور رکھی جائے۔ ایک اور شخص کی موت ملکہ کے لئے اذیت ناک ثابت ہوئی۔

۱۷مارچ سنہ ۱۸۸۳ کو ملکہ سیڑھیوں سے گریں۔ ایک ہفتے وہ بستر سے لگی رہیں۔ آخر جان براؤن نے انہیں اٹھا کر گھوڑا گاڑی میں بٹھایا تو وہ ہوا خوری کے لئے نکلیں، لیکن چلنا پھرنا اب بھی دوبھر تھا۔ اسی دوران یہ ہوا کہ جان براؤن کو محل کا لان صاف کرتے ہوئے ایسی ٹھنڈ لگی کہ وہ بھی بستر سے لگ گیا اور ملکہ کو دیکھنے بھی نہ آسکا۔ اس کی حالت بگڑتی گئی، ملکہ کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ ان کے ذاتی معالج، سر ولیم جینر اور نئے نئے معالج، ڈاکٹر ریڈ Reid براؤن کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ یہی ڈاکٹر ریڈ آگے چل کر ہماری اس داستان کے سب سے بڑے ولین بننے والے ہیں۔

۲۹مارچ کو ایک شہزادے نے آکر ماں کو خبر سنائی کہ جان براؤن مر گیا ہے۔

ملکہ کا سارا وجود بکھر کر رہ گیا۔ وہ ایک نہایت عمدہ ملازم سے اور ایک وفا شعار دوست سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ انہوں نے کسی سے کہا۔ "وہ میرا سب سے اچھا اور سب سے سچا دوست تھا۔ جیسے میں اس کی تھی"۔ ابھی تک تو ان کے لئے چلنا پھرنا دوبھر تھا، اب کھڑے ہونے میں بھی دشواری ہونے لگی۔ وزیروں سفیروں کے علاوہ شاعر ٹینیسن اظہار تعزیت کے لئے ملکہ کے پاس آئے اور ایک شعر بھی کہا جس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے:

وہ ملازم سے زیادہ دوست تھا، وفادار، سچا اور بہادر
قبر میں بھی فرض اس کی ذات سے افضل رہا۔

بائرن جیسے شاعر نے بھی براؤن کی شان میں چند سطریں لکھیں۔

وقت گزرتا گیا۔ ملکہ کا دکھ کم نہ ہوا۔ انہوں نے لکھا۔ "بڑی مشکل سے میں چند قدم چلی۔ کاش میرے پیارے براؤن کے مضبوط بازو مجھے تھام سکتے۔"

ایک مہینے بعد درباریوں کو اڑتی اڑتی خبر ملی کہ ملکہ وکٹوریا جان براون کے روزنامچے کی مدد سے اس کی زندگی کی حالات شائع کرانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ کچھ عرصے بعد ان کے ایک مشیر کو کتاب کا مسودہ ملا، ملکہ نے مشیر کی رائے مانگی تھی۔ اس نے اپنا یہ بوجھ دوسرے درباریوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اب سب نے ایک ہی رائے ظاہر کی کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ملکہ کے خالص ذاتی جذبات واحساسات ہیں جنہیں اجنبی پڑھیں گے تو دل میں خدا جانے کیا سوچیں گے، اس لئے اس کے شائع نہ ہونے ہی میں عافیت ہے۔

جب ہر ایک نے ایسا ہی خیال ظاہر کیا تو ملکہ نے ان سب کو لکھا کہ یہ کتاب عام اشاعت کے لئے نہیں بلکہ صرف آپس والوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد جان براؤن کی زندگی کے حالات پر مشتمل یہ کتاب ایسی غائب ہوئی، یا غائب کی گئی کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

ملکہ نے براؤن کی موت پر اپنے پوتے شہزادہ جارج کو لکھا: "میں نے اپنا سب سے پیارا، سب سے اچھا دوست کھو دیا کہ اب اس دنیا میں کوئی بھی کبھی اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اپنی دکھیا، بوڑھی دادی کے سب سے اچھے، سب سے سچے دوست کو کبھی نہ بھولنا"۔

محل میں براؤن کے آخری برس کسی واردات کے بغیر گزرے حالانکہ وہسکی سے اس کا شغف ایک روز بھی کم نہ ہوا۔ سب جانتے تھے کہ ملکہ کو چائے ناپسند تھی۔ ایک بار براؤن نے چائے بنا کر انہیں پیش کی، ملکہ کو وہ چائے بہت پسند آئی۔ براؤن نے بتایا کہ اس نے چائے میں ایک چمچہ وہسکی کا ملا دیا ہے۔

اس کے مضبوط بازو آخر تک ملکہ کے گرد حلقہ کیے رہے۔ اس نے کئی بار ملکہ کو گھوڑے سے گرنے سے بچایا۔ بے قابو گھوڑی کی پشت پر سے بحفاظت اتارا۔ شرابی کوچوان نے گاڑی گڑھے میں گرا دی تو براؤن نے بچایا۔ ایک پگلے حملہ آور کی پستول اس نے اس تیزی سے چھینی کہ ملکہ کے محافظ دنگ، اور خود حملہ آور بھونچکا رہ گیا۔ ملکہ اپنے شامیانے میں بیٹھ کر چار چار، پانچ پانچ گھنٹے سرکاری کاغذ دیکھتیں، جان براؤن باہر بت بنا کھڑا رہتا تاکہ جوں ہی ملکہ گھنٹی بجائیں وہ حاضر ہو جائے۔ اس نے سیاحوں اور اخبار نویسوں کو کبھی ملکہ کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنے قرب کے باوجود اس نے سیاست میں دخل دینے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ہاں اگر کبھی اس کی رائے طلب کی گئی تو اکثر وہ رائے صائب نکلی۔

براؤن کچھ جھگڑالو بھی تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کے دوسرے ملازموں کو قابو میں رکھتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو درباریوں نے دیکھا کہ وہی معمولی ملازم چھوٹی چھوٹی شکایتیں لے کر سیدھے ملکہ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک بار اس نے وزیر اعظم گلیڈسٹن کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ بس تم بہت بول چکے۔

اس میں ایک بڑا عیب یہ تھا کہ ملکہ اور ان کے بچوں کے درمیان آتا تھا۔ شہزادی ایلس کہا کرتی تھیں کہ براؤن کو ملکہ سے ہر معاملے پر بات کرنے کی آزادی تھی جب کہ بچوں پر پابندی تھی کہ صرف اسی

موضوع پر بات کریں جس سے ملکہ کو دلچسپی ہے۔ ولی عہد پرنس آف ویلز سے تو براؤن کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ ہر وقت ملکہ کے کان میں کچھ نہ کچھ پھونکتا رہتا تھا۔ ایک بار شہزادے نے رقص کا اہتمام کیا۔ کچھ روز بعد ملکہ نے شہزادے سے اظہار افسوس کیا کہ رقص کی شام کامیاب نہیں رہی۔ یہ بات انہیں براؤن نے بتائی تھی۔

وکٹوریا کے پرائیوٹ سکریٹری پونسونبی Ponsonby اس کی خوبیوں اور خرابیوں سے واقف تھے۔ انہوں نے لکھا: وہ واحد شخص تھا جو ملکہ سے ان کی مرضی کے خلاف کام کرا سکتا تھا۔ یوں وہ ہر بار کامیاب نہیں ہوا، نہ ہی اس کی رائے ہمیشہ سب سے بہتر نکلی۔ لیکن وہ دیانت دار تھا اور تعلیم کی کمی کے باوجود اور اپنے اکھڑ پن، تعصبات اور دوسری خامیوں کے باوصف وہ بلاشبہ ملکہ کا بہترین خادم تھا۔

اس کی شاندار قبر بنی تو ہر طرف سے لوگ قبر دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ ادھر سے گزرنے والی گھوڑا گاڑیاں وہاں دس منٹ ٹھہرتیں تاکہ مسافر اتر کر جان براؤن کی قبر دیکھ سکیں۔ گلیڈسٹن تک ایک بار وہاں گئے۔

مشہور ہے کہ ایک حادثے میں ملکہ کا انگوٹھا مُڑ گیا تو براؤن ہی اس کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ پھر براؤن کے انگوٹھے پر پھوڑا نکلا تو ملکہ خود اس کے مکان پر جاتیں اور اپنے ہاتھ سے پرانی وہسکی پلاتیں۔
کبھی کبھی اس پر اشتعال کا دورہ پڑتا تو ملکہ آٹھ آٹھ آنسو روتیں، وہ مستقل ملازمت چھوڑنے کی دھمکیاں دیتا، ملکہ کے کمرے میں دستک دیئے بغیر داخل ہوتا، ان کی کرسی پر ڈٹ کر بیٹھتا اور مغلظات بھی بکتا۔

اس کے مرنے کے بعد یہ ہوا کہ ہر طرف براؤن کی تصویریں اور مجسمے لگے، اس کی یادگاریں سجیں، اور ملکہ مضمحل تھیں، مضمحل رہیں۔

ان ہی دنوں خود مختاری کا مطالبہ کرنے والے آئرلینڈ کے دہشت گردوں نے لندن کے ایک سرکاری دفتر میں بم کا دھماکا کیا۔ کچھ روز بعد ایک شخص نے ملکہ پر حملہ کیا لیکن دو لڑکوں نے حملہ آور کو دبوچ لیا۔

سلطنتِ برطانیہ میں جگہ جگہ لڑائیاں ہو رہی تھیں، خود ملک کے اندر گلیڈسٹن ایک بار پھر وزیر اعظم بن گئے تھے اور سب جانتے تھے کہ وہ ملکہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ان کی کابینہ میں ایسے وزیر شامل تھے جو کہتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ برطانیہ سے بادشاہت کو چلتا کیا جائے۔ ان کے وزیر خارجہ

نے لکھا کہ یہ ملکہ مدبر تو نام کو بھی نہیں، یہ تو بچوں جیسی ہے لیکن اس کے ساتھ بچوں جیسا سلوک اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی کبھی مدبروں جیسے کام کر جاتی ہے۔

ملکہ اس ادھیڑ بن میں مصروف ہوئیں تو ان کا دھیان بٹا۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر میں اپنے آدمی کو حاکم بنا کر بٹھا رکھا تھا، اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اس پر برطانیہ کی پندرہ ہزار فوج وہاں پہنچی اور اپنے سے کہیں بڑی باغی فوج کو شکست دے کر قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ فتح کی خبریں سن کر اہل برطانیہ نے جشن منایا۔ جشن منانے والوں میں ملکہ بھی تھیں کیونکہ مصر کی اس مہم میں ان کا چہیتا بیٹا آرتھر بھی شامل تھا۔ واپسی پر وہ ماں کے لئے ایک قالین لایا جو اس نے شکست خوردہ دشمن کے خیمے سے چھینا تھا۔ بعد میں جس وقت ملکہ نے فاتح فوجیوں کو تمغے دیئے تو وہ اسی قالین پر کھڑی تھیں جیسے شکاری اپنے مارے ہوئے شکار پر کھڑا ہوتا ہے۔

جان براؤن کا رنج ابھی تک آنسو بن کر ملکہ کی آنکھوں سے چھلکا پڑ رہا تھا کہ ان پر ایک اور غم ٹوٹا۔ ان کا بیٹا لیوپولڈ اچانک مر گیا۔ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹی، ملکہ کا سینہ پھٹ پڑا۔ وہ ابھی صرف اکتیس برس کا تھا۔ وہ اپنے پیچھے ماں سے بھی زیادہ اداس بیوی اور ایک بچی چھوڑ گیا، بیوی امید سے تھی۔

وکٹوریا کو اپنے بڑھاپے کا اس سے زیادہ احساس شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ انہوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا: میں ایک دکھیا، پریشان حال بڑھیا ہوں۔ اب تو میرے غموں کا پیالہ چھلکا پڑ رہا ہے۔ اے خدا، رحم کر اور کچھ ایسا کر کہ میرے باقی بچے جیتے رہیں۔

ملکہ معظمہ کو کیا خبر تھی کہ موت ان پر ایک بار پھر پہاڑ بن کے ٹوٹنے کو تھی۔

انگریز فوج نے قاہرہ پہنچ کر حاکم مصر کی لڑکھڑاتی حکمرانی کو ایک بار تو سنبھال لیا لیکن اس طرح کی بیساکھیوں کو ہمیشہ یہی ہوا کہ دیمک چاٹ گئی۔ مصر تو چپ رہا لیکن سوڈان میں قیامت کا شور اٹھا۔ وہ جو کب سے وعدے کی تکمیل کی آس میں جی رہے تھے ان کو محمد احمد نامی ایک درویش نما شخص نے نوید سنائی کہ میں ہی مہدی ہوں، مہدئ موعود۔ یہ بات ۱۸۸۱ء کی ہے۔ اس نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے چاہنے والے برہم دیوانوں کی طرح طوفان بن کر اٹھے اور حاکم مصر اور اس کی مددگار غیر ملکی فوج کے در و دیوار لرزنے لگے۔

یہیں سے وکٹوریا کا نیا المیہ شروع ہوتا ہے۔

سنہ ۱۸۸۳ء اپنے خاتمے کے قریب تھا کہ برطانیہ میں خبر پہنچی کہ جنرل ہکس Hicks یا ہکس پاشا کی کمان میں جو انگریز اور ان سے بھی زیادہ مصری فوج سوڈان میں چھاؤنیاں ڈالے ہوئے تھی، مہدی سوڈانی کے شیدائیوں نے ان میں سے دس ہزار مصری فوجیوں کو نیزوں اور برچھیوں سے چھید چھید کر مار ڈالا۔ ایک نیزہ جنرل ہکس کا کام تمام کر گیا اور انہیں روندتا ہوا یہ مہدوی غول اب سر اٹھائے مصر کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس پر لندن میں گلیڈ سٹن کی کابینہ نے اعلان کیا کہ سوڈان چھوڑ دیا جائے اور شہر خرطوم اور دوسرے مقامات پر جو چھاؤنیاں ہیں ان کے آدمیوں کا بچا کر نکال لیا جائے۔

وکٹوریا کے لئے یہ شکست سراسر ذلت تھی۔ بہر حال انہوں نے سوڈان میں اپنی سپاہ کو بچانے کے لئے کابینہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ قدرت نے وزیر اعظم کو بیمار ڈال دیا اور ان کی غیر موجودگی میں کابینہ کا جو اجلاس ہوا اس نے اچانک فیصلہ کیا کہ ہر مہم سے کامیاب لوٹنے والے جنرل گورڈن کو سوڈان بھیجا جائے۔ انہیں جو ہدایات دی گئیں وہ یہ تھیں کہ وہ جا کر سوڈان کی صورتحال کا جائزہ لیں تاکہ فوج وہاں سے نکال لی جائے، اور اسی طرح کے دوسرے فرائض انجام دیں۔ ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ جا کر سوڈان پر قبضہ کر لیں۔ گورڈن نے یہ باتیں کچھ زیادہ توجہ سے نہیں سنیں۔ انہوں نے اپنی بہن کو لکھا: ہم سب ایسے پیانو ہیں جنہیں حالات بجاتے ہیں۔

جارج گورڈن اکیاون برس کے تھے۔ کون سی مہم تھی جو انہوں نے سر نہیں کی۔ اسی لئے وہ ملکہ اور فوجیوں کے چہیتے تھے۔ جب وہ میدانِ جنگ میں جاتے تو ایک چھڑی ان کے ساتھ ہوتی تھی جسے وہ فتح کی چھڑی کہتے تھے۔ ایک نسخہ انجیل کا ان کے ہمراہ ہوتا تھا لیکن وہ اتوار کے اتوار گرجا گھر ذرا کم ہی جاتے تھے۔

انہیں سوڈان بھیجنے کے فیصلے کا عوام نے بڑا خیر مقدم کیا۔ وزیر اعظم کے سوا ہر ایک خوش تھا۔ صرف ملکہ کو یہ خیال تھا کہ گورڈن کو بھیجنے میں دیر کر دی گئی ہے۔ ۱۸ جنوری کو گورڈن لندن سے روانہ ہوئے۔ پورے ایک مہینے بعد شہر خرطوم نے ان کا یوں خیر مقدم کیا جیسے وہ بھی کوئی موعود ہوں۔ چار دن بعد گورڈن کا تار آیا کہ اگر کمک بھیج دی جائے تو بڑی مدد ملے گی۔

حکومت نے پوچھا کہ کمک کس بات کی؟ انہیں تو انخلا کے لئے بھیجا گیا ہے، قبضہ کرنے کے لئے نہیں۔ ایسے ہی مباحثوں میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ۱۸ مارچ کو مہدی نے شہر خرطوم کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ گورڈن کی جان خطرے میں ہے، یہ بات حکومت کے سوا ہر ایک جانتا تھا۔ دو مہینے بعد گلیڈ سٹن نے ملکہ کو جتایا کہ گورڈن کی مدد کے لئے تازہ دم کمک بھیجی جا رہی ہے۔

وزیراعظم نے یہ بات کہہ تو دی لیکن اس کے بعد کچھ اس قسم کی گفتگو شروع کر دی کہ چونکہ گورڈن کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے اس لئے اسے کمک منگانے کا حق نہیں۔

خرطوم کا محاصرہ طول کھینچتا گیا اور اس طرح چھ مہینے گزر گئے۔ برطانیہ میں عام لوگ اپنے وزیراعظم کی ٹال مٹول پر شور مچانے لگے۔ کوئی ایک مہینے بعد کمک دریائے نیل میں داخل ہوئی۔ گورڈن نے ۲۴ اکتوبر کو اپنی ڈائری میں لکھا: اگر وہ ۳۰ نومبر سے پہلے نہیں آتے تو کھیل ختم ہے۔

کھانا پینا ختم ہو چکا تھا اور گورڈن اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اپنی پرانی دوربین سے صحراؤں میں دیکھا کرتے تھے۔ یہ دوربین انہوں نے پرانے سامان کی دکان سے پانچ پاؤنڈ میں خریدی تھی۔ لیکن اگر مددگار آتے دکھائی نہ دیئے تو اس میں اس فرسودہ دوربین کا کیا قصور؟

دشمن کے طبل جنگ کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ ڈائری میں ۱۴ دسمبر کو گورڈن کی آخری تحریر یوں ہے: یہ بات دھیان سے سن لی جائے۔ اگر فوجی مہم دس دنوں کے اندر نہیں آتی تو شہر پر دشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ رہ گیا میں، تو میں نے اپنے وطن کی عزت کی خاطر جو کچھ بن پڑا وہ کر دیا ہے۔ خدا حافظ۔ سی جی گورڈن۔

مددگار فوج کے دس ہزار جوان ۲۸ جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم کے مقابل پہنچے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ دو دن پہلے مہدی کی فوج نے گورڈن کے گھر میں داخل ہو کر انہیں نیزوں سے مار ڈالا تھا۔

پورا برطانیہ رنج والم میں ڈوب گیا۔ البتہ وزیراعظم تھیٹر دیکھنے گئے تو ان کی صورت سے یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

وکٹوریا بیمار ہو گئیں۔ ان کی صورت سے صاف لگتا تھا کہ وہ چھیاسٹھ برس کی ہونے والی ہیں۔ ان کے دانتوں میں درد رہنے لگا۔ انہیں سرکاری کاغذات پڑھنے میں دشواری ہونے لگی۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ اتنا بڑھا کہ اب ان کے لئے برش پکڑنا اور تصویر بنانا مشکل ہو گیا۔ وہ چھڑی پکڑ کر چلتی تھیں لیکن اب وہ پہیوں والی کرسی کو ترجیح دینے لگیں۔ ان کی ورزش کم ہوئی تو موٹاپا بڑھ گیا۔ کسی نے انہیں دیکھ کر کہا کہ وہ جتنی اونچی ہیں اتنی ہی چوڑی ہیں۔ ان کی بھویں لٹک گئیں، ناک سرخ رہنے لگی اور نتھنے بے ہنگم ہو گئے۔ دہانہ دونوں جانب جھک گیا اور وہ مغموم نظر آنے لگیں۔ پپوٹے پھول گئے یہاں تک کہ وہ خود کو آئینے میں دیکھتیں تو کہتیں کہ میں کتنی بدصورت ہو گئی ہوں۔

مگر نصف دنیا کی حکمراں کی شخصیت میں اعتماد اب بھی غضب کا تھا۔

ایک جشن، ایک جوان

اس روز لندن میں بڑا جشن تھا۔ پورے برطانیہ سے پانچ لاکھ آدمی ملکہ کی گولڈن جوبلی کا جشن دیکھنے آئے تھے۔ زیادہ تر نے اس سے پہلے کوئی برطانوی بادشاہ دیکھا ہی نہ تھا۔ وکٹوریا کی حکمرانی کو پچاس سال پورے ہو رہے تھے اور اس خوشی میں پورا شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ ہر طرف بینڈ باجوں کا شور اور پریڈ کرتے فوجیوں کے قدموں کی دھمک تھی۔ لوگ ایک رات پہلے سے سڑک کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تاکہ ملکہ کی سواری گزرے تو ان کو قریب سے دیکھ سکیں۔

ملکہ نے بھی اپنے نظارے کا خاص خیال رکھا تھا اور کھلی گھوڑا گاڑی میں نکلنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا پولیس مجمع پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ ان دنوں ملکہ پر حملہ کرنے کا فیشن سا چل نکلا تھا اس لئے حفاظت کا سخت بندوبست تھا۔ ملکہ کو شاید ہندوستان کے گھوڑسوار فوجی دستے پر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا جسے ان کی گاڑی کے آگے آگے چلنا تھا۔

پورے پچاس سال پہلے یہی جون کی اکیس تاریخ تھی اور سنہ ۱۸۳۷ء تھا جب ایک اٹھارہ سال کی گھبرائی ہوئی، سہمی ہوئی لڑکی گاڑی میں بیٹھ کر پہلی بار اپنے سر پر تاج رکھنے گئی تھی۔ اس وقت وزیراعظم ملبرن Melbourne نے اس کی کتنی ہمت بڑھائی تھی۔ آج ملبرن کو انتقال کیے برسوں گزر چکے تھے اور ملکہ خوداعتمادی کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔

صبح ہی سے محل میں دنیا بھر سے آنے والے مبارک سلامت کے پیغامات کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر جانب سے تحفے تحائف چلے آ رہے تھے۔ آگرے سے ایک سابق قیدی نے ملکہ کی شان میں اور جوبلی کی خوشی میں اردو اور انگریزی میں کئی قطعے لکھ کر بھیجے جن میں سے ایک کچھ یوں تھا:

یا خدا، ملکہ عالیہ کا نام وکٹوریا ہے
ہماری طرف وکٹوریا کو فتح کہتے ہیں۔

اور کیسا عجب اتفاق کہ میرے ضلعے کا نام فتح پور ہے۔

اس اتفاق سے بڑھ کر نیک شگون اور کیا ہو گا۔

مدراس سے سنسکرت میں ایک نظم موصول ہوئی جس میں لکھا تھا کہ ریل گاڑی اور دخانی جہاز کی عطا ملکہ کی جانب سے آسمانی تحفے کی مانند ہے۔ سندھ کے قصبے ٹھٹھی میں حکام نے 'ملکہ وکٹوریا جوبلی قبرستان اور شمشان' کھول کر جشن منایا۔

جلوس کے وقت دھوپ چمک کر نکلی۔ لوگوں نے کہا یہ برطانیہ کا نہیں، ملکہ کا موسم ہے۔ ملکہ اپنی شیشے کی بند گاڑی کی بجائے کھلی گاڑی میں بیٹھیں جسے چھ گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ ساری دنیا کا پہناوا بدل گیا تھا لیکن ملکہ اپنا تیس سال پرانی وضع کا لباس زیب تن کر کے نکلیں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ پرانی گڑیا جیسی نظر آ رہی ہیں۔ البرٹ کے سوگ میں انہوں نے جو سیاہ ریشمی لبادہ پہننا شروع کیا تھا، وہ اس وقت بھی پہنا اور گلے میں بے حد قیمتی زیور کے علاوہ وہ لاکٹ بھی بطور خاص ڈالا جس میں البرٹ کی تصویر تھی اور جس کے گرد ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

آگے آگے گھوڑوں پر سوار ملکہ کے بیٹے، داماد، پوتے، نواسے، اور پوتیوں، نواسیوں کے شوہر تھے اور سب کے سب وردی میں تھے۔ ان کے پیچھے، اور ملکہ کی کھلی گاڑی کے آگے پیشوائی کے لئے شاندار گھوڑوں پر سوار، ان سے بھی زیادہ شاندار ہندوستانی فوج کے ایسے وجیہ اور خوش قطع جوان سوار تھے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کے سامنے دوسرے سارے سوار پانی بھریں۔

لاکھوں کا مجمع دیر تک تالیاں بجاتا رہا۔ ہر طرف نعرے بلند ہونے لگے۔ خوشی کے عالم میں بعض لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خود ملکہ نے کہا کہ میں نے دل میں کھب جانے والا ایسا منظر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

یہ جشن ہفتوں چلا۔ دعوتیں اور ضیافتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ہندوستان سے تمام بڑے راجا، مہاراجا اور ان کی رانیاں بھی انگلستان آ گئیں۔ ملکہ نے بھی ان کے اعزاز میں ہندوستان جیسے تکلفات کا اہتمام کیا۔ بس انہیں ایک بات کی کوفت کھائے جا رہی تھی۔ ہندوستانی رانیوں اور شہزادیوں کی زبان اردو تھی اور ملکہ کو اردو نہیں آتی تھی۔ وہ مہمانوں سے گفتگو نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس بات پر وہ بار بار جھلائیں۔

وکٹوریا کا سن ستّر کے قریب پہنچا تو یوں لگا جیسے ان کا لڑکپن لوٹ آیا ہو۔ وہ کھلکھلاتیں، ان کے رخسار شرم سے سرخ ہو جاتے، کبھی وہ حیا سے اپنا چہرہ چھپا لیتیں۔ اپنی سہیلیوں میں بیٹھتیں تو لطیفے کہتیں اور نہ صرف اپنے بڑھاپے کا مذاق اڑاتیں بلکہ یہ بھی کہتیں کہ وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگی ہیں۔

عین ان ہی دنوں آگرے کا ایک چوبیس سالہ، خوب رو اور ذہین جوان ان کی زندگی میں داخل ہوا۔

محمد عبدالکریم۔

وکٹوریا کا پیارا عبدل۔

اور درباریوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکنے والا منشی عبدالکریم۔

پردہ اٹھتا ہے

۲۱ جون ۱۸۸۷ء کی صبح بوڑھی ملکہ قصر ونڈسر میں اپنے ناشتے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ میز پر رکھی ہر چیز ٹھوس سونے کی تھی۔ سونے کی پلیٹیں، سونے کے چھری کانٹے، جھلملاتی چائے دانی، یہاں تک کہ انڈے کی وہ پیالی بھی سونے کی تھی جس میں شاہی انڈا دھرا تھا۔

ملکہ کے دائیں بائیں اجلی اچکن اور تنگ پاجامے پہنے، سر پر سنہری دھاریوں والے صافے باندھے، کمر پر پٹکا کسے، ہاتھ باندھے، نگاہیں جھکائے ان کے دو خدمت گار شیخ غلام مصطفیٰ اور شیخ چڈا کھڑے تھے۔ یہ دونوں جوبلی کے برس میں ہندوستان سے آئے تھے۔ جان براؤن کو مرے چار سال ہو چکے تھے اور شاید کسی کا خیال تھا کہ وکٹوریا کو ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں سے جو دلچسپی ہے، کیا عجب کہ ان کے آس پاس سانولی رنگت اور ترشی ہوئی ڈاڑھیوں والے جوان موجود ہیں تو ان کا دل بھی بہلا رہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ملکہ نے اپنی خوشنودی کا ایسا والہانہ اظہار کیا کہ کارپردازانِ ہند نے اور دو خادم اس شان سے بھیجے کہ جس وقت لندن میں جوبلی کا جشن جاری تھا، ان دونوں کو تربیت دی جا رہی تھی کہ ملکہ کے حضور کیسے دست بستہ حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کریں۔

سامنے کا دروازہ کھولا گیا۔ دو نوجوان فرشی سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے، قریب آئے اور ملکہ کی قدم بوسی کی، اور پھر پیچھے ہٹ کر، ہاتھ باندھ کر، نگاہیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں ایک محمد بخش تھا، گہری سانولی رنگت، چہرے پر ایک مسلسل مسکراہٹ اور بدن پر ایک تہہ فربہی کی۔

دوسرا عبدالکریم تھا، چوبیس سال کا جوان، چھریرا بدن، دراز قد، چہرے پر متانت اور آنکھوں میں بلا کی ذہانت۔ ملکہ نے اس پر ایک نگاہ کی تو صاف لگا کہ اس کے اوصاف سب سے جدا، سب سے الگ ہوں گے۔

ان خدمت گاروں کو ہند میں صوبہ جات شمال غربی کے گورنر سر جان ٹائلر Tyler نے خود چن

کر، دیکھ بھال کر، ٹھوک بجا کر بھیجا تھا۔ محمد بخش انگلستان آنے سے پہلے راجپوتانہ کے پولیٹیکل ایجنٹ، جنرل ڈینہی Dennehy کے ملازم اور دھولپور کے رانا کے خادم تھے۔ انہیں حاکم کو اٹھانے بٹھانے اور کھلانے پلانے کا سلیقہ آتا تھا۔

عبدالکریم نے اردو اور انگریزی کی تعلیم پائی تھی۔ وہ آگرے میں دس روپے ماہانہ کے محرر تھے۔ وہی آگرہ جہاں میڈیکل اسکول کھل چکا تھا جہاں کروڑوں کی آبادی کو علاج معالجہ فراہم کرنے کے لئے ہندوستانیوں کو ضرورت بھر تربیت دے کر، اور ہاتھ میں سند تھما کر چہار جانب بھیج دیا جاتا تھا۔

عبدالکریم کے والد حاجی محمد وزیرالدین بھی انگریزی خواں اور اسی میڈیکل اسکول کے سند یافتہ تھے، برصغیر میں یہ لوگ ڈاکٹر ہی کہلاتے تھے۔ وزیرالدین آگرہ جیل میں معالج تھے۔ وہ اس زمانے میں ساٹھ روپے تنخواہ پاتے تھے جو اس وقت کی بہت معقول آمدنی تھی اور کسی معمولی دواساز یا کمپاؤنڈر کو اتنی اجرت نہیں مل سکتی تھی۔

جس روز عبدالکریم نے ملکہ کی قدم بوسی کی، ملکہ نے اسی دن اپنے روزنامچے میں لکھا کہ اس کے والد آگرہ میں دیسی ڈاکٹر ہیں۔ لیکن بعد کے مورخ آج تک اصرار کرتے ہیں کہ عبدالکریم نے انہیں گمراہ کیا اور یہ بتایا کہ وہ آگرہ میں سرجن جنرل ہیں۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ عبدالکریم انگلستان آئے تو پہلے انہیں ویٹر کے فرائض سونپے گئے حالانکہ ہندوستان میں انہیں اس کام کا ذرا سا بھی تجربہ نہ تھا۔ خود عبدالکریم لکھتے ہیں کہ انہیں ابتدا میں ملکہ معظمہ کا منشی اور انڈین کلرک مقرر کیا گیا۔ یہ ان کی مبالغہ آرائی تھی۔ کم سے کم ایک تصویر ایسی موجود ہے جس میں وہ شاہی خاندان کو کھانا کھلاتے نظر آ رہے ہیں۔ ہاں، ہو سکتا ہے کہ یہ صورت حال جلد ہی بدل گئی ہو کیوں کہ ملکہ سے بات منوانے کا مرحلہ زیادہ دور نہیں تھا۔

عبدالکریم نے ۲۳ جون کو محل میں قدم رکھا، پورے چالیس دن بعد ملکہ نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

'میں کچھ ہندوستانی لفظ سیکھ رہی ہوں تاکہ اپنے ملازموں سے بات کر سکوں۔ اس زبان اور اس کے بولنے والوں سے میرا حقیقی ربط و ضبط کب ہوا تھا مگر ان دونوں سے مجھے بہت ہی رغبت ہے۔'

یہ بولی قیصر ہند کی رگ و پے میں سما گئی۔ ایک چھوٹا سا کتابچہ ترتیب دیا گیا جس میں تمام ضروری ہندوستانی فقرے اور لفظ درج کر کے اسے نہ صرف شہزادیوں، شہزادوں بلکہ محل کے تمام عملے میں تقسیم کیا

گیا تا کہ وہ سب بھی اہلِ ہند سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ ملکہ کے پرائیوٹ سکریٹری سر ہنری نے لکھا: ' ملکہ نے مجھے پڑھنے کے لئے ہندو الفاظ کی فہرست دی ہے'۔ اتنے بڑے شخص کو لفظ ہندو اور ہندوستانی کا فرق بھی نہیں معلوم تھا۔

اسی طرح عبدالکریم اور دوسرے خدمت گزاروں کے لئے انگریزی اتالیق مقرر کیا گیا۔ محمد بخش کے سابق آقا، میجر جنرل ڈینہی Dennehy کو ہندوستانی ملازموں کا نگراں بنادیا گیا۔ اس وقت ملکہ کا رویہ ایسا تھا جیسے کوئی نیا کھلونا کسی بھولے سے بچے کے ہاتھ لگا ہو۔ ملکہ کو یہ فکر ستائے جاتی تھی کہ خالی وقت میں یہ بے چارے کیا کریں گے، ان کا دل کیسے بہلے گا۔ اجنبی ماحول میں یہ کہیں اکتا نہ جائیں۔ چنانچہ آگے چل کر ہندوستان سے ان کی بیویوں کو بلا لیا گیا۔

پتہ چلا کہ ملازموں کی دیکھ بھال کا کام ڈینہی کے بس کا نہیں لہٰذا انہیں ہٹا کر ملکہ نے اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر ریڈ Reid کو خدمت گاروں کا معالج ہی نہیں بلکہ افسر فلاح و بہبود بھی مقرر کر دیا۔

ملکہ کے اسکاٹ لینڈ جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ ان ہندوستانیوں کو بھی ان کے ساتھ جانا تھا اور بہت سے نئے نئے فرائض سنبھالنے تھے۔

ملکہ نے ڈاکٹر ریڈ کو ایک تحریری یادداشت بھیجی جس میں لکھا تھا:

" جب ہم باہر باغ میں ناشتہ کریں اور محمد بخش اور عبدالکریم حاضر ہوں تو وہ اپنا نیا گہرا نیلا لباس پہنیں۔ دوپہر کے کھانے پر انہیں چاہئے کہ اپنی کوئی سی 'پگڑی' اور اپنی پسند کی پٹی باندھیں البتہ سنہری پگڑی نہ باندھیں۔ البتہ رات کے کھانے پر وہ دونوں اپنا لال لباس پہنیں، سفید اور سنہری پگڑی باندھیں اور پٹی باندھیں۔ اگر بارش یا سردی ہو اور ہم ناشتہ اندر کریں تو وہ ہمیشہ حاضر رہیں۔ جب ہم اوپر ہوں تو وہ کمرے کے باہر ہماری گھنٹی کی آواز پر حاضر ہوں ۔ آئندہ ہمارے سرکاری کاغذات کے صندوق اور خطوط لڑکیوں کے بجائے یہی لایا لے جایا کریں۔ اسی طرح سہ پہر کی چائے پر لڑکیوں کے بجائے یہی حاضر رہیں۔ اسکاٹ لینڈ میں چونکہ موٹا اونی لباس درکار ہوتا ہے ، ان لوگوں کے لئے موٹے اونی کپڑے کا لباس فراہم کیا جائے جسے یہ اپنے فرصت کے اوقات میں پہن سکیں لیکن ضروری ہے کہ یہ لباس ہندوستانی وضع کا ہو اور ساتھ پگڑی بھی ہو۔ (ملکہ کو لفظ پگڑی بہت پسند تھا جسے وہ pageri لکھتی تھیں)۔ اس کے علاوہ انہیں اونی موزے اور دستانے اور پیدل چلنے

کے لئے موزوں جوتے بھی فراہم کئے جائیں۔اور جب دن چھوٹے ہوجائیں اور سردی بڑھ جائے تو چائے ہمیشہ اندر ہی پلائی جائے۔ سات آٹھ ہفتوں میں دن چھوٹے ہوجائیں گے تو ان لوگوں کو چاہئے کہ چائے کے بعد ہی ہماری گھنٹی پر آجایا کریں کیونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد اس کا وقت نہیں رہتا"۔

اپنے ہندوستانی خدمت گاروں کے لئے ملکہ نے ادھر اُدھر کے خیالات جمع کر کے یہ ساری ہدایات لکھ دیں جنھیں بعد میں ڈاکٹر ریڈ نے صاف کر کے میجر جنرل ڈینی کو دکھالیا۔ اس وقت ملکہ اپنی سی ہر کوشش کرتیں کہ یہ ملازم انگلستان ہی کو اپنا گھر سمجھیں، البتہ وہ یہ بھی نہیں چاہتیں کہ ان کی زندگی بے ذائقہ ہو جائے۔ اسی لئے اسکاٹ لینڈ کی اونی ٹوئیڈ کا ہندوستانی لباس سلوایا گیا۔ یہ لوگ اپنا کھانا بھی خود ہی پکاتے تھے۔ محمد بخش اور عبدالکریم اپنی مرغیاں خود ذبح کرتے ہوں گے۔ ان کے گھر میں مرغ کا قورمہ اور مچھلی کا سالن پکتا ہوگا جس کے مسالے ہندوستان سے آتے ہوں گے۔

ان ہی دنوں ملکہ نے عبدالکریم سے اپنے پہلے اشتیاق کا اظہار کیا ہوگا، اور وہ یہ کہ کبھی ہمیں اپنا کھانا کھلاؤ۔ کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ ان کے 'عبدل' نے ان کے لئے ہندوستانی سالن پکائے جو ملکہ نے کھائے۔ یقین ہے کہ منشی نے مرچیں ڈالنے سے گریز کیا ہوگا۔

بالمورل میں ملکہ کو ایک اور فکر لاحق ہوئی۔ یہ بیچارے خدمت گار خالی وقت میں کیا کریں گے۔ انہوں نے اسی تفکر کے عالم میں ڈاکٹر ریڈ کو ایک اور نوٹ لکھا: " کھانے کے بعد ان لوگوں کو ان کے کمروں میں بھیجنے میں عجلت نہ کی جائے، وہ چاہیں تو اوپر کی یا نیچے کی راہ داریوں میں رہیں یا جس کے ساتھ چاہیں وقت گزاریں کیونکہ وہ گھر سے باہر ہوتے ہیں تو ان تک رسائی نہیں رہتی۔یہ مسئلہ اسکاٹ لینڈ کا ہے۔ اوسبورن اور ونڈسر میں تو ان کے لئے کمرے بنائے جارہے ہیں جو گھر سے جڑے ہوں گے"۔

ایک بات صاف ظاہر ہے۔ عبدالکریم کو بھرتی کرتے وقت اس پر یہ بات واضح نہیں کی گئی ہوگی کہ ملکہ کے حضور اسے کھانے کی میز پر حاضر رہنا ہوگا۔ بھرتی کرنے والے کو خود بھی اچھی طرح معلوم ہوگا کہ کریم کو اس کام کا نہ سلیقہ آتا ہے، نہ قرینہ۔ البتہ محل میں فرائض سونپنے والے نے ایسا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔

ملکہ کو بہت جلد احساس ہوگیا کہ کھانے کے جھوٹے برتن اٹھانا عبدالکریم کے شایان شان نہیں۔

یہ احساس دلانے میں خود عبدالکریم کی کام چلانے والی انگریزی اور ملکہ کی ٹوٹی پھوٹی اردو نے کام کیا۔ دونوں نے دو باتوں سے اتفاق کیا۔ ایک یہ کہ عبدالکریم ان پڑھ بیرا نہیں اور دوسرے یہ کہ وہ کسی گرے پڑے گھر کا جاہل اجڈ فرد نہیں بلکہ آگرے کے ایک متمول گھرانے کا تعلیم یافتہ فرزند ہے جب کہ اہل انگلستان نے نہ جانے کیوں یہ قیاس کر لیا ہے کہ یہ کم حیثیت لوگ ہیں۔

وکٹوریا کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ ان میں نسلی تعصب نام کو نہیں تھا۔ لیزن جیسی جرمن ملازمہ پر وہ فریفتہ تھیں اور جان براؤن جیسے اسکاٹش خادم پر وہ جان چھڑکتی تھیں۔ اس بار بھی انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ ان کے ہندوستانی ملازموں کو محل میں موزوں مقام عطا ہوگا اور ان کے ساتھ اسی احترام سے پیش آیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ملکہ نے یہ کام ڈاکٹر ریڈ کو سونپا:

"براہ کرم اس بات کا خیال رکھئے گا کہ میرے اتنے اچھے ہندوستانی لوگوں کو اعلیٰ ملازموں کا مقام حاصل ہو جو کہ ان کا جائز مقام ہے۔ انہیں ہمارے بڑے کمرے سے دور نہ رکھا جائے۔ انہیں ہر ممکن آرام فراہم کیا جائے تاکہ رات کے وقت انہیں سردی نہ لگے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ قریب رہیں، انہیں دور کہیں ڈال دینا بہت برا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ فرانسی (ملکہ کا اسکاٹش ملازم) ان انتظامات میں دخل نہیں دے گا کیونکہ وہ بہت متعصب ہے اور مہربان ہونا اس کی فطرت ہی میں نہیں"۔

فرانسی کی نوبت بعد میں آتی، ان باتوں پر سب سے پہلے خود ڈاکٹر ریڈ کا ماتھا ٹھنکا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ملکہ کے پردے میں کوئی اور بول رہا ہے، غالباً ملکہ کا پیارا عبدل۔ ڈاکٹر نے اس بارے میں ملکہ سے کھل کر بات بھی کی جس میں تلخی بھی آئی، اور یہیں سے ان کے درمیان اختلافات کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو قیصر ہند، ملکہ معظمہ کے مرنے کے بعد تک چلا۔

شاہی معالج جینر Jenner نے ریڈ کو لکھا اور شاید سارا معاملہ جاننے کے بعد لکھا: "تم نے ان ہندوستانیوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، میرا خیال ہے کہ ملکہ تمہاری باتوں کی قدر کریں گی۔ میں تو حیران ہوں کہ عبدل کو وہی کمرہ دیا گیا ہے جو جان براؤن کا کمرہ تھا۔ جو لوگ عرصہ ہوا مر کھپ گئے مجھے ان کے بھوت کے لوٹ آنے پر یقین نہیں ورنہ میں یہی سمجھتا کہ اس کمرے میں بھوت آ گیا ہے"۔

براؤن تو اسکاٹ لینڈ کا اجڈ دیہاتی تھا۔ عبدالکریم گنگا جمنی زمینوں میں پروان چڑھا تھا، اس نے وہ مقام پا لیا کہ وہ ملکہ کو سامنے بٹھا کر میر، غالب اور مومن کے شعر یوں سنانے لگا جیسے وہ ملکہ ہی کے لئے

کیے گئے ہوں۔

عبدالکریم ابھی تک اپنے نام کے ساتھ لفظ 'حافظ' نہیں لکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن دنوں وہ انگلستان گئے، قران حفظ کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ بات انہوں نے ملکہ کو بتائی ہو گی۔ اتنی ضخیم کتاب زبانی یاد کرنے کی کوشش پر ملکہ حیران ہوئی ہوں گی۔ کریم نے انہیں اپنی حفظ کی ہوئی آیات سنائی ہوں گی۔ اس قرأت نے ان پر کیا اثر کیا، یہ تو معلوم نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ عبدالکریم نے دین کے بارے میں ملکہ کے سوالوں کے جواب دینے شروع کیے جس کے بعد یہ موضوع بھی ان کی تعلیم کا ایک حصہ بن گیا۔

ایک اور موضوع جس کی ملکہ نے تعلیم حاصل کی وہ ہندوستانی ثقافت اور رسم ورواج کا عنوان تھا۔ وکٹوریا کو یوں بھی ہندوستانی طور طریقوں سے اور رہن سہن، یہاں تک کہ وہاں کے گلی کوچوں سے گہرا شغف تھا۔ خود انہیں ہندوستان جانے کا ارمان تھا۔ اپنی گولڈن جوبلی کے فوراً بعد انہوں نے اپنے بیٹے وکی کی بیوی کو، جو شوہر کے ساتھ ہندوستان میں تھی، لکھا:

'میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ بچوں کولے کر تمہارے پاس آؤں۔ اگر وکی نومبر میں میرے پاس نہیں آتا تو میں ہی آنے کی کوشش کروں گی۔ کچھ عرصے سے مجھے ہندوستان جانے کی شدید خواہش ہو رہی ہے۔ ان باتو ں سے تم سوچتی ہو گی کہ میں دیوانی ہوں، لیکن سچ مانو، اِدھر کچھ عرصے سے میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔'

لیکن جب جانے کا امکان نظر نہ آیا تو انہوں نے روڈولف سوَ-بودا Swoboda جیسے نام ور مصور کو ہندوستان کے دورے پر بھیجا تاکہ وہ وہاں کے لوگوں، ان کے گھر آنگن اور کوچہ وبازار کی تصویریں بنا کر لائے۔ وہ اپنی آئل پینٹنگز کا ذخیرہ لے کر لوٹا جنہیں وکٹوریا نے اپنے اوسبورن کے قصر کی ہندوستانی راہداری میں آویزاں کیا۔

اسی سوَ-بودا کو ملکہ نے عبدالکریم کی شبیہ بنانے کا حکم دیا۔ ان کو انگلستان آئے ابھی صرف ایک سال ہوا تھا۔ وہ تصویر آج تک محفوظ ہے اور بتاتی ہے کہ وہ ملکہ کے دل میں کیوں کھب گئے۔ ایک سال بعد ملکہ نے اپنی نگاہ کمزور ہونے اور ہاتھوں میں رعشہ کے باوجود اسی تصویر کی نقل خود بنائی جو ان کی زندگی کی آخری تصویروں میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے محمد بخش کا پورٹریٹ بھی بنوایا اور اس کی نقل اُور تین سال بعد بنائی۔ ملکہ نے عبدالکریم کی ایک اور شبیہ اتنے ہی عظیم مصور انجیلی Angeli سے بنوائی اور

اس کا پس منظر سنہرا رکھوایا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کا بیٹا دلیپ سنگھ جب جلاوطن ہو کر ملکہ کے پاس آیا تو اس نوخیز شہزادے کی قد آدم تصویر بنانے کا کام ونٹر ہالٹر جیسے مصور کو سونپا گیا۔ دلیپ سنگھ وکٹوریا کو بہت عزیز تھا۔ یوں بھی اسے گھیر گھار کر کوہ نور جیسا تحفہ اسی کے ہاتھوں ملکہ کو دلوایا گیا تھا۔

لیکن ملکہ اور عبدالکریم کے درمیان تحفوں کے تبادلے کی نوعیت مختلف تھی۔ جب وہ ہاتھ پکڑ کر ملکہ سے اردو لکھوانے لگے، اس وقت شاید وہ پہلی بار ملکہ سے روٹھے۔ وکٹوریا نے سبب پوچھا ہو گا تو انہوں نے کہا کہ اس طرح کی ملازمت ان کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اعلیٰ گھرانے کے انسان ہیں اور بیرا گری ان پر زیب نہیں دیتی۔

غالباً اسی وقت اور ان ہی کے مشورے سے طے ہوا کہ آج سے وہ ملکہ کے اتالیق کہلائیں گے، اور اس کے لئے منشی کی اصطلاح بھی عبدالکریم ہی نے تجویز کی ہو گی۔ ان کے اصرار پر یہ بھی طے ہوا کہ وہ سارے فوٹو تلف کئے جائیں گے جن میں شاہی کنبہ کھانا کھاتا ہوا نظر آ رہا ہے اور عبدالکریم وردی پہنے، دست بستہ کھڑے ہیں۔

یوں منشی عبدالکریم تاریخ میں منشی کے نام سے مشہور ہوئے۔

اور یوں وہ ملکہ کی میز کے قریب کھڑے ہو کر ان کے خطوں کی سیاہی خشک کرتے کرتے ان کے خط کے مضمون انہیں سُجھانے لگے۔ تمام سرکاری دستاویزیں بند صندوقوں میں آتی تھیں۔ اکثر میں سرکاری راز بھی ہوتے تھے۔ ان صندوقوں کو سنبھالنے کا فرض منشی کو سونپا گیا۔ ہندوستان سے آئی ہوئی عرضداشتیں وہ منشی کے حوالے کر دیتیں اور انہیں نامنظور کرنے کا فرض بھی وہی انجام دیتے۔

وکٹوریا اپنے پیارے عبدل سے بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے ڈاکٹر ریڈ کو لکھا کہ عبدل کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ اب بہت بدل گیا ہے۔ اگرچہ اس کے طور طریقے میں سنجیدگی اور متانت ہے، میری ملازماؤں کے ساتھ اس کا رویہ بہت دوستانہ ہے، اب تو وہ ہنستا ہے بلکہ مذاق بھی کرتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ آ کر اس کی خوش نما چیزیں دیکھیں۔ وہ انہیں کھانے کے لئے کیک پیش کرتا ہے۔ وہ بہت کام کا آدمی ہے، ذہین ہے اور صاحبِ سلوک ہے۔ اپنی زبان کا جو اسے بڑا علم ہے اور اس باعث وہ بہت کارآمد ہے، اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اب میرے لئے بہت سہل ہو گیا ہے۔

ملکہ نے ۱۴ اپریل ۱۸۸۹ء کو اپنے ذاتی سکریٹری سر ہنری کو لکھا:

'عبدالکریم کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اس میں بلا کی سرگرمی ہے،'

بات دھیان سے سنتا ہے، خاموش طبیعت ہے اور اس میں نفاست ہے، ذہین ہے اور خوش ذوق ہے اور (تمام ہندوستانیوں کی طرح) نہایت فرض شناس ہے اور میرے ذرا سے اشارے پر حکم بجالانے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتا ہے۔ وہ جلد ہی میرے لئے عبارتوں کی نقل کرنے لگے گا، نہ صرف انگریزی میں بلکہ فرانسیسی میں بھی۔حساب کتاب رکھنا بھی اسے خوب آتا ہے۔ اپنے احساسات اور طرز عمل کے معاملے میں وہ نہایت شریف النفس ہے۔'

جیسے جیسے عبدالکریم ملکہ سے قریب ہوتے جارہے تھے، آس پاس کی ساری خلقت سے ان کی دوری بڑھتی جارہی تھی۔ لوگ ان کا نام سن کر برا منہ بناتے، چڑتے، الٹی سیدھی باتیں کرتے جن میں توہین کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔ یہ تو وہ زمانہ تھا جب کوئی انگریز کسی رنگ دار آدمی کے ہاتھ سے لے کر پانی پینا بھی گوارانہ کرتا، اور راجا مہاراجا سے کم منصب والے شخص کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی برداشت نہ کرتا، اس دور میں آدھی دنیا کی ملکہ اپنی اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ ہندوستانی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اپنی جوبلی کے موقع پر وہ ہندوستانی شہزادوں کی جس طرح آؤ بھگت کر رہی تھیں اسے دیکھ کر سر ہنری نے کہا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کے اتنے لاڈ لار کیوں کرتی ہیں؟

۲۶ اپریل کی شام ولی عہد شہزادے نے سینڈر نگھم میں تھیٹر کا اہتمام کیا جس میں اس وقت کے دو عظیم اداکار کام کر رہے تھے۔ اس کے لئے شاہی عمارت میں نہایت حسین اسٹیج بنایا گیا۔ یہیں وہ لاجواب مکالمے ادا کئے جانے تھے جنہوں نے لندن کے تھیٹر میں دھوم مچادی تھی۔ پورا شاہی خاندان یہ ڈراما دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ ملکہ دو دن پہلے وہاں پہنچ گئیں۔ ان کے جلو میں منشی بھی تھے۔ جس وقت سارے مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بٹھائے گئے، عبدالکریم کو احساس ہوا کہ انہیں ملازموں کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ اس میں ان کی سراسر توہین تھی لہٰذا وہ اٹھے اور تماشاگاہ سے نکل گئے اور روٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جب ملکہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے منشی ہی کی حمایت کی اور کہا کہ بلاشبہ، عبدل کو اشرافیہ کے ساتھ بیٹھنا چاہئے۔

اسی دوران محل میں وہ نجی تقریب ہوئی ہوگی جس میں ملکہ کو بتایا گیا ہوگا کہ منشی نے قرآن حفظ کرلیا ہے لہٰذا وہ اب حافظ کہلائے جائیں گے۔ ۱۳ مئی ۱۸۸۹ء کے ایک خط میں جب ملکہ نے ان کا نام 'منشی حافظ عبدالکریم' لکھا تو شور اٹھا کہ ایک نہ شد، دو شد۔ ابھی تو وہ صرف منشی تھے، اب عزت بڑھانے کے لئے انہیں حافظ کا لقب بھی دے دیا گیا۔ شور مچانے والے لوگ وہی تھے جو ہندوستان کی ہر چیز کو ہندو کہتے تھے۔

ملکہ کا یہ خط ان کا پہلا دبنگ اعلان تھا۔ ہوا یہ کہ ہندوستانی خدمت گاروں کی آمد کا سلسلہ چل نکلا۔ ہر طرح کے لوگ آنے لگے جو سارے کے سارے مسلمان تھے اور جو دیکھ رہے تھے کہ ان ہی جیسا ایک خدمت گار ملکہ کا منظور نظر بن بیٹھا ہے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہ منشی اعلیٰ سفید فام حکام کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے تو انہوں نے چغلیاں کھانی شروع کر دیں۔ ڈاکٹر ریڈ نے یہ شکایتیں دھیان سے سنی ہوں گی اور ملکہ سے اس بارے میں بات کی ہوگی۔ ملکہ نے وہ ساری بات منشی کو بتائی ہوگی جس کے بعد ڈاکٹر کے نام ملکہ کا ایک لمبا چوڑا خط آیا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ منشی کے مقابلے میں دوسرے خدمت گاروں کی کیا حیثیت ہے:

" ملکہ عالیہ نہایت واشگاف الفاظ میں اپنی یہ خواہش دوہرانا چاہتی ہیں کہ ڈاکٹر ریڈ کو چاہئے کہ احمد حسین کو منشی حافظ عبدالکریم کے خلاف منہ سے کوئی بات نکالنے یا شکایت کرنے کی اجازت نہ دیں کیونکہ وہ سب سے اول ہیں۔ ان کے خاندان کو ہمیشہ جو مقام حاصل رہا ہے اور ان کی جو اعلیٰ تعلیم ہوئی ہے اس کے سبب سے اب انہیں اہم مقام حاصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کے وہ پہلے دن ہی سے مستحق تھے جوملکہ کے پریوی پرس کے کلرک کے برابر ہے، اس کے علاوہ کریم ملکہ کے ذاتی ہندوستانی کلرک بھی ہیں۔ وہ تمام ہندوستانیوں کا حساب کتاب دیکھتے ہیں، ان کا لباس تیار کراتے ہیں، علاوہ ازیں وہی ہیں جو ملکہ کے صندوقوں ، خطوط اور کاغذات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ملکہ چاہتی ہیں کہ دوسرے لوگ ان سے ہر معاملے میں مشورہ اور مدد لیا کریں ۔عبدل نے دکھا دیا ہے کہ کوئی سبب نہیں کہ لوگ ان کی ترقی پر فخر نہ کریں۔انہوں نے ہمیشہ وہی کام کئے ہیں جن سے لوگ خوش ہوں، انہوں نے کبھی کسی کام سے انکار نہیں کیا، لیکن وہ غیر معقول باتوں کو ناپسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملکہ کے احکامات پر سختی سے عمل کیا جائے۔ وہ احمد حسین سے اچھی طرح واقف ہیں جو اگر چاہتا ہے کہ اسے بھی اول مقام حاصل ہو یا کم سے کم ہر بات میں ان کے برابر ہو تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ احمد نے عبدل کی پیٹھ پیچھے جو حرکت کی ہے اس سے ملکہ کو شدیدصدمہ پہنچا ہے۔ ڈاکٹر ریڈ کو چاہئے کہ کچھ بھی ہوجائے، نہ اس کی شکایت پر کان دھریں اور نہ چغلی خوری کی حوصلہ افزائی کریں جو نہایت غلط بات ہے۔"

اس میں ڈاکٹر ریڈ کا بھی کچھ ایسا قصور نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ احمد حسین پر افسردگی کے دورے پڑ رہے تھے اور ملکہ نے ان سے کہا تھا کہ اس کا سبب معلوم کریں۔ احمد حسین نے منشی عبدالکریم کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھولا ہوگا اسی پر ملکہ نے الزام لگایا کہ ڈاکٹر ریڈ لوگوں کی شکایتوں پر کان دھرتے ہیں۔

اسی سال جون کے مہینے میں ایک اور ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔

حرمت پر آنچ

اس قصے کا راوی کوئی اور نہیں، ڈاکٹر ریڈ ہیں، جنہیں منشی عبدالکریم ایک آنکھ نہ بھائے۔

یہ جون ۱۸۸۹ء کی ایک سہ پہر کی بات ہے۔ بالمورل کی کاٹیج میں چائے پینے کے بعد ملکہ اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی شال اور لباس کی درمیان پن کا کام کرنے والا بروچ لاپتہ ہے۔ یہ قیمتی بروچ انہیں تحفے میں ملا تھا۔ اب اس کی تلاش شروع ہوئی۔ کاٹیج کی تلاشی لی گئی، اس کی غلام گردش کی بجری تک ٹٹولی گئی لیکن بروچ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گاڑی کے پائیدان پر حاضر رہنے والے شخص نے کسی نجی نشست میں کہا کہ ہو نہ ہو یہ بروچ عبدالکریم کے سالے حرمت علی نے چرا لیا ہے جو چائے پلانے کے بعد وہیں کاٹیج میں منڈلاتا نظر آیا تھا۔ ظاہر ہے یہ بات ملکہ کو نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے اور ملکہ اپنے بروچ کے بارے میں دریافت کرتی رہیں۔

ایک روز محمد بخش نے ملکہ کو لباس پہنانے والی خواتین کو بتایا کہ حرمت علی نے ایک بروچ ونڈسر کے ایک سنار کے ہاتھ چھ شلنگ میں بیچا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ حرمت کو بروچ کہاں سے ملا البتہ ایسا بروچ خود حرمت کا نہیں ہو سکتا۔

اگلے روز ان میں سے ایک خاتون نے سنار کو لکھا کہ اس نے ہندوستانی ملازم سے جو بروچ خریدا ہے اسے فوراً محل میں بھیجے۔ دو دن بعد سنار نے وہ بروچ بھیجا جس کے ساتھ اس نے لکھا کہ ایک ہندوستانی نے بروچ یہ کہہ کر اسے بیچا ہے کہ یہ اسی کا ہے، اور یہ کہ وہ شخص اس کی دکان پر بار بار آیا، کبھی کبھی دن میں کئی کئی بار۔ آخر پیچھا چھڑانے کے لئے اسے یہ بروچ خریدنا پڑا۔ وہ چونکہ ملکہ کا ملازم ہے اس لئے خیال ہوا کہ بروچ اسی کی ملکیت ہوگا۔ وہ شخص تو مختلف چیزیں بیچنے کے لئے اکثر آتا رہتا ہے، ہاں خود کبھی کچھ نہیں خریدتا۔

ملکہ کو لباس پہنانے والی خاتون وہ بروچ اور سنار کا خط لے کر سیدھی ملکہ کے پاس پہنچیں اور سارا قصہ بیان کیا۔ ملکہ نے پہلے تو حیرت کا اظہار کیا، پھر اچانک وہ آگ بگولا ہو گئیں کہ تم لوگ حرمت کو بدنام

کرنا چاہتے ہو۔ پھر وہ چیخیں۔ 'تم انگلستانیو، کیا یہی تمہارا انصاف ہے۔' اور وہ بری طرح ناراض ہوئیں۔

اس کے بعد انہوں نے عبدل سے بات کی اور خاتون کو بلا کر کہا کہ خبردار جو تم نے کسی سے اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا۔ حرمت تو دیانت داری کا مجسمہ ہے، راستبازی اس پر ختم ہے۔ وہ کوئی چیز چرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ عبدل کہتا ہے کہ حرمت کو بروچ ملا تھا جو اس نے اٹھا لیا کیونکہ ہندوستان کا رواج یہ ہے کہ کوئی چیز ملے تو اٹھا لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرو۔ اس نے صرف اپنے ملک کی روایت پر عمل کیا۔

ڈاکٹر ریڈ لکھتے ہیں کہ اس طرح ثابت ہو جانے والی چوری بھی ایمان داری کی مثال ٹھہری، محض ایک شخص، عبدالکریم کی خاطر۔

محل کے عملے میں اس پر سنسنی پھیل گئی ہو گی۔ لوگ برہم ہوئے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہماری زندگیوں میں در آنے والا یہ شخص نفرت زدہ ہے۔

اپنے پیارے منشی پر ملکہ عنایات کی جو بارش کر رہی تھیں، ڈاکٹر ریڈ نے کبھی کبھی اس سے لطف بھی اٹھایا۔

اوسبورن کے محل سے انہوں نے ملکہ کے سابق معالج، ڈاکٹر جینر Jenner کو لکھا کہ محل میں مجھے نیا کمرہ ملا ہے جو بہت اچھا ہے۔ سنا ہے کہ ملکہ نے نہ صرف میرا پرانا کمرہ بلکہ اس سے ملا ہوا بڑا کمرہ بھی عبدل کو دے دیا ہے حالانکہ یہی کمرہ انہوں نے مجھے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں، بس صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ملکہ کی نگاہ میں میری کتنی قدر ہے اور عبدل کی کتنی۔

اس جلن کا خود ڈاکٹر کے پاس بھی علاج نہیں تھا۔

اگست میں ملکہ سرکاری دورے پر شمالی ویلز گئیں جس کے بعد پورے عملے سمیت وہ بالمورل منتقل ہو گئیں۔ وہاں جنرل ڈینی بھی تھے۔ ہندوستانی عملے کے بارے میں ان کا ملکہ سے مباحثہ ہوا۔ وہیں عبدالکریم اور کسی ہندوستانی ملازم کا جھگڑا ہوا اور ملازم کو اگلے ہی ہفتے چلتا کیا گیا۔

ڈاکٹر کی جلن میں ابھی اور اضافہ ہونا تھا۔

۱۷ اکتوبر کو ملکہ نے اپنے آگرے کے گل فام کو ساتھ لیا اور اسکاٹ لینڈ کی ایک دلکش جھیل کے کنارے بنی ہوئی اپنی اس خوش نما کوٹھی کو چلی گئیں جہاں بس وہ چین اور سکون کی تلاش میں جایا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر ریڈ نے اپنے دوست جینر کو لکھا کہ ملکہ رات وہیں گزاریں گی۔ ۱۸۸۲ء کے بعد وہ پہلی بار وہاں گئی ہیں کیونکہ جان براؤن کی موت کے بعد انہوں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اب وہ وہاں کبھی نہیں سوئیں گی۔ بہرحال اب انہوں نے اپنی رائے بدل دی ہے اور عبدل کو ساتھ لے گئی ہیں۔

اب کے محبوب کی رنگت جدا تھی، اس بار رویہ بھی مختلف ہو گیا۔

جان براؤن کا فضیحتہ تھا تو سارا ملک وکٹوریا کو پیار سے مسز براؤن کہنے لگا تھا اور کہتا تھا کہ ملکہ کے بڑھے ہوئے پیٹ میں ایک اور ننھا سا براؤن پروان چڑھ رہا ہے۔ اس بار ایک ہندوستانی کا قصہ تھا، اب کے لوگوں کا بس چلتا تو عبدل کو انگاروں پر بھونتے۔

کیا عجب کہ اس پرسکون جھیل کے کنارے، جہاں صرف ساحل سے ٹکراتے تھپیڑوں اور شاخوں میں الجھتی ہوا کی آوازوں کے سوا کوئی دوسری آواز نہ ہو، وہاں عبدالکریم نے وکٹوریا کے کانوں میں میر تقی میر، اسداللہ خاں غالب اور مومن خاں مومن کا سحر پھونکا ہو اور دل اور جان سے اٹھنے والا دھواں دکھا کر اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا ہو کہ یہ کہاں سے اٹھتا ہے۔ یا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ شہ کا مصاحب بنا ہے اور اتراتا پھرے ہے وگرنہ شہر میں اس کی آبرو کیا ہے۔ یا دھیرے سے سمجھایا ہو کہ تم ہی میرے پاس ہوتے ہو گویا، جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

دل میں اتر جانے کے راز اب کسی کو نہیں معلوم لیکن عبدالکریم پوری طرح ملکہ کے دل میں جگہ کر گئے تھے۔ کچھ بھی ہو، اس بھاری بھر کم وجود کے اندر وہ باریک سا تار ابھی تک جھنجھنا رہا تھا جسے چھیڑنے والا شہزادہ جمنا کے کنارے سنگِ سرخ سے بنے قلعوں کے جھروکوں سے نکل کر اڑن کھٹولوں پر بیٹھ کر آیا تھا۔

۱۸۹۰ء شروع ہوا تو عبدالکریم کو بیماریوں نے آن دبوچا۔ پہلے انہیں خارش ہوئی، اس سے سنبھلے تو گردن پر پھوڑا نکل آیا۔ ملکہ نے گھبرا کر ریڈ کو لکھا اور شاہی لب و لہجے میں لکھا:

'ملکہ اپنے نہایت نفیس عبدل کی طرف سے سخت فکر مند ہیں جو اُن کے لئے نہایت گراں قدر ہے اور جو اب تک تن درست اور توانا تھا۔ وہ ہمیشہ اتنا صحت مند اور تنو مند رہا ہے کہ اس کی تکلیف دیکھ کر ملکہ پریشان ہیں۔ انہیں ان سب کی طرف سے فکر رہتی ہے کہ کہیں یوں نہ ہو کہ یہ آب وہوا انہیں راس نہ آئے۔ یہ سب میرے لئے بڑے کام کے لوگ ہیں اور میں اب تک یہ سوچ کر خوش تھی کہ یہ سب اچھے ہیں اور انہیں کوئی

تکلیف نہیں۔ عبدل نہایت عمدہ انسان ہے ، وہ دنیا میں ہر لحاظ سے اتنا اعلیٰ ہے کہ اسے کچھ ہو جائے تو ملکہ خصوصیت کے ساتھ تشویش میں مبتلا ہوتی ہیں۔'

ریڈ نے منشی کا علاج شروع کیا اور پھوڑے پر پلٹس باندھنے لگے۔ خود ملکہ دن میں کئی کئی بار ان کے کمرے میں جاتیں، 'ان کے ہاتھوں کو سہلاتیں'، ان کے تکیے کی شکنیں نکالتیں، ان کی گردن کی دیکھ بھال کرتیں، اپنے سرکاری کاغذ وہیں بیٹھ کر دیکھتیں اور وہیں بیٹھ کر اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھتیں۔

ایک منشی ہی نہیں، ان کا کوئی بھی ملازم بیمار ہوا تو ملکہ ہمیشہ فکر مند ہوئیں لیکن پہلے جان براؤن اور اب عبدالکریم کی علالت پر ان کا حال زیادہ ہی برا ہو رہا تھا۔ ممکن ہے لوگ کہتے ہوں کہ یہ طرزِ عمل ایک ملکہ کے شایانِ شان نہیں، لیکن خود ملکہ کے لئے عبدالکریم ایک ملازم سے بڑھ کر تھے۔ مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کوئی گود لیا ہوا بچہ ہو جو اپنے گھر سے دور ہو اور جسے پیار اور دھیان کی ضرورت ہو۔

منشی کی گردن کے پھوڑے کو جراحت درکار تھی۔ ملکہ نے کہا کہ ڈاکٹر ریڈ ایک اور ماہر ڈاکٹر کی رائے لے لیں۔ وہ اس پر تو آمادہ نہیں ہوئے لیکن ایک اور ڈاکٹر نے آکر ہاتھ بٹایا تو چیرا دیا گیا اور منشی دیکھتے دیکھتے ٹھیک ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک منشی ہی نہیں، اپنے ہر ہندوستانی ملازم کی بیماری پر ملکہ گھبرا جاتیں۔ ایک بار یوسف سائیکل چلاتے ہوئے گرا اور اس کے دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ملکہ سخت پریشان ہوئیں۔ ایک بار ملکہ فرانس گئیں جہاں احمد حسین کو کھانسی ہوئی جس کے ساتھ ایک سو ایک بخار چڑھا۔ ملکہ نے صبح شام اس کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور کہا کہ انہیں ہر بار صحیح درجۂ حرارت بتایا جائے۔

منشی عبدالکریم اب وکٹوریا کے لختِ جگر بن گئے تھے۔ بوڑھی ملکہ کے نزدیک اب ان سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ منشی کو اپنی اس حیثیت کا اچھی طرح احساس تھا۔ شاید ادھر آگرے میں ان کے والد بھی بخوبی جان گئے تھے کہ ملکہ ان کے بیٹے کی کوئی بات ٹال نہیں سکتیں۔ وہی والد جن کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی تھی کہ وہ انڈین آرمی میں سرجن جنرل ہیں یا آگرے کی جیل میں قیدیوں کی دواؤں کی پڑیاں باندھا کرتے ہیں۔

وہ جو کچھ بھی تھے، بیٹے کی طرح ملکہ کے منظورِ نظر وہ بھی تھے۔

یہاں سے پہلے فرمائشوں اور پھر مطالبوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

دوا کے نام پہ زہر

ڈاکٹر ریڈ کہتے ہیں ایک روز منشی ان کے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں دواؤں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی، یہ دوائیں ان کے والد نے منگائی تھیں۔ منشی نے کہا کہ ملکہ کی خواہش ہے کہ یہ دوائیں آگرے بجوائی جائیں۔

ریڈ کہتے ہیں کہ فہرست میں کوئی ساٹھ زہریلی دوائیں درج تھیں، اور ہر دوا بھاری مقدار میں منگائی گئی تھی۔ مثلاً چھ پاؤنڈ کلورل ہائیڈریٹ، چھ آونس مارفین، بارہ آونس نائٹریٹ آف سلور، تین پاؤنڈ کلوروڈین وغیرہ۔ غرض یہ کہ اسی طرح کے زہر بڑی مقدار میں منگوائے گئے تھے۔ ڈاکٹر ریڈ نے حساب لگایا کہ اتنا زہر بارہ سے پندرہ ہزار بالغوں کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، اور بچوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

ریڈ نے اپنی جان یہ کہہ کر چھڑائی کہ وہ ہند میں سر جان ٹائلر کو لکھ دیتے ہیں کہ یہ ساری دوائیں وہیں کسی انگریزی دوا فروش سے خرید کر منشی کے والد کو دے دی جائیں اور ان کا بل انگلستان بھجوا دیا جائے، ملکہ نے یہ تجویز مان لی البتہ کہا کہ منشی کو کسی صورت بھی ناراض نہ کیا جائے اور اسے یہ سارا معاملہ پیار محبت سے سمجھایا جائے۔

کچھ عرصے بعد سر جان ٹائلر Tyler ونڈسر آئے تو ریڈ نے ان سے پوچھا کہ منشی کے والد کی اصل حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی میڈیکل ڈپلوما نہیں، انگلستان کے معیار سے وہ سند یافتہ بھی نہیں۔ انہوں نے آگرہ میڈیکل اسکول میں پڑھا ہے جس کا ان کے پاس سرٹیفکٹ ہے جس کی مناسبت سے وہ ہاسپٹل اسسٹنٹ ہیں۔ ہندوستان میں یہ لوگ دیسی ڈاکٹر کہلاتے ہیں۔ ٹائلر نے ریڈ سے کہا کہ میں ان کو اہمیت دیتا ہوں کیونکہ ملکہ نے ان کے بیٹے کو اعلیٰ حیثیت دے دی ہے اور ملکہ ان کی ہر بات مانتی ہیں۔ اب ان کے والد چاہتے ہیں کہ بیٹے کے منصب کی مناسبت سے ان کا درجہ بھی بلند کیا جائے۔

جون ۱۸۹۲ء میں منشی کے والد خود انگلستان آ گئے۔ ملکہ نے ان کو عبدالکریم کے ساتھ ایڈنبرا بھیجنے کا اہتمام کیا۔ شہر کے بالمورل ہوٹل میں ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ وہاں یونی ورسٹی، اسپتال اور جیل دیکھیں گے۔ وہاں سے ریڈ کے دوست نے انہیں لکھا کہ کاش ایسا ہو جائے کہ دونوں اسی جیل میں ہمیشہ کے لئے چین سے رہیں۔

یہ لوگ جو بیٹے سے جلتے تھے، باپ سے بھی کھنسانے لگے۔ اب ہر طرف یہ چرچا ہوا کہ منشی کا خاندان معمولی، ان کے بزرگ گھٹیا اور ان کے باپ گرے پڑے ہیں۔ نیچ ذات کا لفظ برطانیہ میں کبھی اتنی کثرت سے استعمال نہیں ہوا ہوگا، چنانچہ محل میں کہا جانے لگا کہ منشی نیچی ذات کا دھوکے باز ہے جو ملکہ کو جُل دے کر بڑی بڑی رعایتیں حاصل کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکہ وکٹوریا کی زندگی میں اب ہر طرف عبدل ہی عبدل تھے۔ پہلے وہ 'منشی' یعنی ملکہ کے استاد ہوئے۔ پھر انہیں سرکاری طور پر ملکہ کا 'انڈین سکریٹری' نامزد کیا گیا۔ اس کے لئے انہیں ایک دفتر دیا گیا اور ان کے ماتحت محرر مقرر کئے گئے۔ (جو وہ خود صرف چند برس پہلے آگرے کی جیل میں رہ چکے تھے اور دس روپے تنخواہ پاتے تھے)۔

ملکہ کے مشیروں اور منشی کے حریفوں نے خط لکھ لکھ کر ہندوستان سے عبدالکریم کا 'کچا چٹھا' منگایا اور پوری رپورٹ بنا کر ملکہ کو بھیجی۔ اس میں منشی کے حسب نسب کو مشکوک ٹھہرایا گیا تھا۔ رپورٹ پڑھتے ہی وکٹوریا پر برہمی کا دورہ پڑا اور انہوں نے اپنے ذاتی مشیر سر ہنری کو وہ خط لکھا کہ جس کے حوالے سے وکٹوریا کی کوئی سوانح خالی نہیں۔

اپریل کی دس تاریخ تھی۔ یہ بات سنہ ۱۸۹۴ء کی ہے۔ ملکہ نے لکھا:

"یہ ثابت کرنا کہ بے چارہ منشی اتنا نیچ ہے، حقیقتاً تن بدن میں آگ لگانے والی بات ہے اور خصوصاً انگلستان جیسے ملک پر یہ باتیں زیب نہیں دیتیں جہاں میں جانتی ہو ن کہ دو آرچ بشپ ایسے ہیں کہ ایک کا باپ قصائی اور دوسرے کا پرچون فروش تھا۔ عبدل کے والد نے ڈاکٹر کی حیثیت سے اچھے دن دیکھے ہیں اور باعزت زندگی گزاری ہے۔ اس طرح کی باتوں سے عبدل کا دل کڑھتا ہے۔ یہ باتیں شاید کم درجہ ہندوستانی حاسدوں یا اینگلو انڈین لوگوں نے کہی ہیں۔ مجھے بے چارے منشی کی حساس طبیعت کے خیال سے دکھ ہوا ہے۔"

۱۱جون ۱۸۹۴ء کو سر ہنری نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا کہ آج سے منشی کو 'حافظ' کہا جائے۔ سر ہنری نے یہ وضاحت ضروری نہیں سمجھی کہ حافظ کس کو کہتے ہیں اور کوئی شخص کسی مخصوص دن سے حافظ کیوں کہلایا جاتا ہے۔ اہل دربار نے کہا کہ لیجئے، اس 'اِنجن' Injun کا رتبہ اور بڑھا دیا گیا۔

اُن ہی دنوں سر ہنری کے بیٹے فریڈرک پونسونبی Ponsonby کو ملکہ کی ملازمت کے لئے ہندوستان سے طلب کیا گیا تھا۔ فریڈرک وہاں وائسرائے کے عملے میں شامل تھے، انگلستان آ کر انہیں ملکہ کی ہم رکابی کا فرض انجام دینا تھا۔ ملکہ خوش تھیں کہ ایک ذہین نوجوان ان کی ملازمت میں آ رہا ہے۔ انہوں نے فریڈرک کو ہدایت کی کہ آگرہ جا کر منشی کے والد ڈاکٹر وزیر الدین سے ملاقات کرے اور ان کے حالات سے مطلع کرے۔

وہ غریب سمجھا کہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔

فریڈرک پونسونبی نے بعد میں جو کتاب لکھی اس میں یہ سارا قصہ درج ہے اور اتنا اہم اور دلچسپ ہے کہ اس کا خلاصہ یہاں بیان کرنا مناسب ہوگا:

"ملکہ میرے والد کو ایک خوش گوار تحفہ دینا چاہتی تھیں چنانچہ انہیں بتائے بغیر ملکہ نے تار دے کر مجھے ہندوستان سے طلب کرلیا۔ میں اس وقت ۲۷ برس کا تھا۔ میں نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ ملکہ نے ایک بار مجھے ایک فرانسیسی ڈرامے میں دیکھا تھا، وہ میری زبان دانی سے متاثر تھیں۔ ان دنوں ان کے سامنے منشی کا مسئلہ تھا اور ملکہ کا خیال تھا کہ میں ہندوستان چھوڑنے سے پہلے یہ مسئلہ حل کرسکوں گا۔ مگر ہوا یہ کہ میں نے پہلے روز ہی ملکہ کو ناراض کردیا اور انہیں معاف کرنے میں برسوں لگے۔

ہوا یہ کہ انہوں نے اپنے ایک خدمت گار عبدالکریم کو ترقی دے کر منشی بنا دیا۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی ، یوں بھی ہندوستان میں منشی ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ عبدالکریم نے اپنے خاندانی پس منظر کا رعب ڈالا اور یہ ڈینگ ہانکی کہ ان کے والد انڈین آرمی میں سرجن جنرل ہیں۔(خود ملکہ نے یہ لفظ ایک بار بھی استعمال نہیں کیا)۔ ملکہ نے مجھے تار دیا اور ہدایت کہ کہ آگرہ جاکر منشی کے والد سے ملوں۔ میں جنرل سورٹن کے ہاں ٹھہرا اور حکم پر عمل کیا۔ پتہ چلا کہ وہ شخص سرجن جنرل

نہیں بلکہ آگرہ جیل میں دواساز ہے۔ میں اس سے ملا اور ہم نے اردو میں باتیں کیں مگر اس زبان کا میرا علم محدود تھا اس لئے زیادہ بات چیت ہندوستان کے موسم اور حسن کے بارے میں ہوئی۔یہ ساری گفتگو بے لطف تھی۔

. میں جب انگلستان آیا اور ملکہ سے ملا تو انہوں نے پوچھا کہ کیامیں نے عبدالکریم کے والد سے ملاقات کی؟ میں نے کہا ہاں، مگر مجھے پتہ چلا کہ وہ آگرہ جیل میں معمولی دواساز ہیں۔ یہ سن کر ملکہ نے سختی سے میری بات کی تردید کی اورکہاکہ میں ضرور کسی غلط شخص سے مل کر آیا ہوں۔ مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔میں تو یہ سمجھا تھاکہ میں کوئی الجھن دور کررہا ہوں مگر پتہ چلا کہ سچ بات کہنے کے لئے بس یہی ایک لمحہ موزوں نہ تھا۔

اس وقت صورت یہ تھی کہ ملکہ ہندوستان سے آنے والے خط اور مراسلے منشی کو دکھا رہی تھیں۔ پتہ چلاکہ ایک ناپسندیدہ شخص منشی کا دوست ہے جس کے ہندوستان میں فسادیوں سے مراسم ہیں۔ (اشارہ رفیع الدین احمد کی طرف ہے جن کا ذکر آگے آئے گا)۔ظاہر ہے کہ اس پر پریشانی ہوئی ہوگی اور بزرگ درباریوں نے احتجاج کرنا اپنا فرض سمجھا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ مشتعل ہوئیں اور ان بزرگوں سے بول چال بند کردی۔ عین اسی مرحلے پر میں اس قصے میں داخل ہوا اور اپنی بے خبری کے عالم میں ملکہ کو منشی کے والد کے بارے میں اصل بات بتادی۔ منشی کی بے اعتباری کے اس ثبوت پر وہ خفا ہوئیں اور مجھ سے روٹھ گئیں۔ ایک اہم درباری نے معاملہ رفع دفع کرایا اور ملکہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہاکہ انہیں حق ہے کہ جو خط چاہیں منشی کودکھائیں۔

ان ہی دنوں ملکہ نے معاملے کا دوسرا پہلو بھی دیکھا اورہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ جارج ہملٹن کا خط ان کی نگاہ سے گزرا جس میں لکھا تھا کہ مستقبل میں وہ خفیہ کاغذات ملکہ کونہیں بھیج سکتے کیونکہ وہ سارے خط منشی کودکھاتی ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ بظاہر یہ چھوٹا سا مسئلہ ہے لیکن اس کے نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے صاف صاف لکھاکہ ہندوستان کے ہندو پسند نہیں کریں گ
ے کہ ایک مسلمان کو ملکہ کا مشیر بنا دیاجائے۔ وہاں کے راجا مہاراجا سمجھ نہیں

سکیں گے کہ ایک منشی کو اتنا اہم منصب کیسے مل سکتا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ نے منشی کو کاغذات دکھانے کا سلسلہ ترک کردیا البتہ اپنے مکمل اعتماد کے اظہار کے لئے کہا کہ آئندہ منشی کو ان کا انڈین سکریٹری کہا جائے۔

مجھ سے خفگی کے اظہار کے لئے ملکہ نے سال بھر مجھے کھانے پر نہیں بلایا۔ فرانس میں ان کے ساتھ ایک ماہ گزارا جہاں کم ہی عملہ تھا مگر مجھے کبھی کھانے پر نہیں بلایا گیا۔میں نے بھی اس دوران ملکہ سے بات نہیں کی۔ صرف ایک روز موسم کے بارے میں ایک جملہ کہا۔ ملکہ کا یہ رویہ سال بھر چلا اور اگرچہ اس کے بعد بھی مجھے معاف نہیں کیا گیا البتہ کبھی کبھار رات کے کھانے پر بلایا جانے لگا۔"

یہ فریڈرک کی تحریر تھی جو اس واقعے کے فوراً بعد منشی کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

اگلے دو برس کھینچا تانی کے برس بن کر گزرے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں طرف تلواریں سونت لی گئی ہیں اور ہر دو فریق مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ملکہ نے ٹھان لیا تھا کہ منشی کا جھنڈا اونچا رکھیں گی۔ ان کے مشیر طے کر چکے تھے کہ یہ جھنڈا خاک میں ملا کر چھوڑیں گے۔ پہلی فتح شہزادہ ایڈورڈ کو ہوئی جنہوں نے منشی کے ساتھ چائے پینے سے انکار کیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر ریڈ نے منشی کے والد کو لندن کے اسپتالوں کی سیر کرانے سے انکار کیا۔ ملکہ نے جوابی حملہ کیا اور ایک غنائیہ ڈرامے میں منشی کی کرسی ایک اعلیٰ خاتون کے برابر میں رکھوائی۔ فریڈرک نے وائسرائے کو لکھا: 'میں تو یہ سوچتا ہوں کہ خوش قسمتی سے منشی کا خاکروب بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا'۔

ملکہ کی سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ انہوں نے متعلقہ حکام کے ہاتھوں عبدالکریم کو سی آئی ای جیسا اعلیٰ اعزاز دلوایا: کمپینین آف دی انڈین امپائر۔ اور ان کے سینے پر ایسٹرن اسٹار سجایا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار منشی حافظ محمد عبدالکریم نے ملکہ سے یہ فرمائش بھی کی کہ انہیں نواب کا خطاب دیا جائے۔ منشی کی یہ غالباً واحد فرمائش تھی جسے ملکۂ عالیہ ٹال گئیں۔

حافظ صاحب دیکھ رہے تھے کہ بڑھاپا ملکہ کو کسی بھی لمحے دبوچ لے گا۔ انہیں اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ادھر ملکہ کی آنکھ بند ہوئی ادھر ان کا ناطقہ بند ہوتا گویا طے ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی روزی روٹی کا بندوبست شروع کیا۔ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ یہ ملکہ کے ذہن کی اختراع تھی یا یہ خیال منشی نے سجھایا کہ انہیں آگرے کے قریب کوئی دولت اگلنے والی زمین دلوا دی جائے۔

ملکہ کی جانب سے وائسرائے لارڈ لینس ڈاؤن کے نام خطوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

پہلا خط ۱۱ جولائی ۱۸۹۰ کو لکھا گیا جس میں تحریر تھا کہ وہ چاہتی ہیں کہ ان کے مثالی اور لاجواب نوجوان منشی، حافظ عبدالکریم کو حکومت کی طرف سے زمین عطا کی جائے۔ انہوں نے لکھا کہ یہ دنیا میں پہلا موقع ہے کہ ایک دیسی باشندہ اس منصب کو پہنچا ہے، وہ چاہتی ہیں کہ یہ صورت حال ایک مستقل شکل اختیار کرلے۔ اس کے علاوہ وہ چاہتی ہیں کہ منشی کے اچھے اور معزز والد ڈاکٹر وزیر الدین کے لئے بھی کچھ کیا جائے جو بوڑھے اور کمزور ہو رہے ہیں۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو نہایت غیر اہم ترقیاں دی گئی ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ حکام نے ایسے ایسے لوگوں کو ترقی دی جو اس کے اہل نہ تھے، بس یہ ہے کہ حکام کو ان سے دل چسپی تھی۔ ملکہ نے لکھا کہ جو لوگ خدمت کرتے ہیں، وہ انہیں خوب نوازتی ہیں اور ہر طرح ان کی مدد کرتی ہیں لہٰذا جب کبھی وائسرائے کا آگرہ جانا ہو تو ڈاکٹر وزیر الدین سے ملاقات کریں اور انہیں بتائیں کہ ملکہ ان کے بیٹے سے کتنی مطمئن ہیں۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وائسرائے کو خط لکھ کر ملکہ چین سے بیٹھ جاتیں لیکن اب تار پر تار جانے شروع ہوئے۔ یکم اگست کے تار میں ملکہ نے لکھا کہ آپ منشی کو جو زمین دلوائیں، ذرا خیال رکھئے گا کہ اس کی سالانہ آمدنی پانچ چھ سو روپے سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ آپ نے منشی کے والد کا تبادلہ کر دیا ہے، ترقی نہیں دی ہے۔ اور یہ کہ منشی کے بھائی کی بھی کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔

وائسرائے نے لکھا کہ حکام کو ہدایت کر دی گئی ہے اور یقین ہے کہ جلد کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکل آئے گا۔ اس نے لکھا کہ زمین کی تلاش جاری ہے لیکن ان دنوں ایسی عمدہ زمین ڈھونڈنا بھی دوبھر ہے۔

۲۸ اگست کو پھر وائسرائے کو شملہ میں ملکہ کا تار موصول ہوا کہ ذرا دیکھنا، منشی کے لئے جو زمین حاصل کی جائے اس کی سالانہ آمدنی چھ سو روپے سے زیادہ ہی ہو۔

منشی ۳۰ اکتوبر کو چار مہینے کی رخصت پر ہندوستان جانے والے تھے۔ وہ اور ملکہ دونوں مل کر بے چین تھے کہ اس سے پہلے پہلے سونا اگلنے والی زمین ہموار ہو جائے۔ وائسرائے کو خبر کر دی گئی کہ منشی آرہے ہیں اور اپنے ہمراہ ملکہ کا خط بھی لا رہے ہیں جو وہ آگرے میں ملاقات کے دوران حوالے کریں گے۔ ملکہ کو خوشی تھی کہ جس جہاز میں منشی جا رہے ہیں اسی میں وائسرائے کی بیگم بھی سوار ہوں گی

کہتے ہیں کہ چلتے وقت منشی پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ اپنی بغل میں ملکہ کا خط لیتے گئے جس میں لکھا تھا:

"یہ ہمارا لاجواب اور بے مثال منشی آرہا ہے، وائسرائے خصوصی توجہ دیں۔ اس کی چار مہینے کی غیر حاضری ہم پر شاق گزرے گی کیونکہ یہ ہر طرح سے ہمارے لئے کار آمد اور مدد گار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسے زمین کا تحفہ جلد ہی مل جائے گا۔ منشی کے والد ۳۲ یا ۳۳ سال کی خدمات کے بعد ریٹائر ہونے والے ہیں، امید ہے انہیں اچھی پنشن دی جائے گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی جگہ ان کے داماد، علم اللہ کو مقرر کر دیا جائے۔ وہ بھی آگرہ جیل میں ڈاکٹر ہیں اور ان کا ۲۵ برس کا تجربہ ہے۔"

منشی ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ وہ سسکیوں سے روئے۔ ملکہ کے بارے میں خبر نہیں لیکن یہ طے ہے کہ منشی کے جاتے ہی یہاں سے ان کے نام ملکہ کے خطوں کا تانتا بندھ گیا اور بجا طور پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بیشتر خط اردو میں لکھے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط کے باقی رہ جانے کی شہادت ملتی ہے۔ دوسرے خط کیا ہوئے؟ اس کا قصہ آگے آئے گا۔

عبدالکریم بخیر و عافیت آگرہ پہنچے۔ راہ میں ان پر اور وائسرائے کی بیوی پر کیا گزری؟ کسی کو خبر نہیں۔ اچھی ہی گزری ہو گی کیونکہ ہندوستان پہنچ کر بیگم وائسرائے نے ان سے ملاقات کی۔ خود منشی نے ۲۳ نومبر کو ملکہ کی چٹھی لارڈ لینس ڈاون کو پہنچاد جنھوں نے فوراً ہی ملکہ کو تار دیا کہ منشی کو ملاقات کا وقت دے دیا گیا ہے۔ ۲۴ نومبر کو ملکہ کا تار آگیا: آج کی اس نوازش کے لئے میری اور منشی کی طرف سے پر جوش شکریہ قبول ہو۔

اس دوران عبدالکریم کے لئے مناسب زمین تلاش کر کے ان کے نام کر دی گئی۔ ملکہ خوشی سے جھوم اٹھیں۔ لیکن قرائن یہ بتاتے ہیں کہ جب وائسرائے نے منشی کو زمین کی تفصیل بتائی تو انہوں نے برا سا منہ بنایا ہو گا۔ اس پر وائسرائے نے بھی کڑوا گھونٹ نگلا اور بے حد سفارتی زبان میں ملکہ کو نہ صرف ساری بات لکھ دی بلکہ کھلے الفاظ میں احتجاج بھی کیا۔ انہوں نے ملکہ کے نام خط میں دو باتیں لکھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دربار میں منشی کو کہاں بٹھائیں۔ اگر راجوں مہاراجوں کے ساتھ بٹھاتے ہیں تو وہ برا مانیں گے۔ وہ یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ انہیں ملکہ کے نمائندے کی حیثیت سے خود اپنے عملے کے ارکان کے ساتھ بٹھائیں۔

وائسرائے نے دوسری بات یہ لکھی کہ جب منشی کو زمین کے بارے میں بتایا گیا تو ان کے انداز سے محسوس ہوا کہ رائے میں قدرے اختلاف کی کیفیت ہے۔ وائسرائے نے لکھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ منشی کو جو زمین دی گئی ہے، اس ملک میں بس کبھی کبھار ہی کسی کو دی گئی ہو گی۔ مثال کے طور پر حال ہی میں

تاج برطانیہ کے ایک جاں نثار کو زمین دی گئی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے غدر کے دوران جب ہر طرف سے گولے چل رہے تھے، اپنی جان پر کھیل کر دہلی کے کشمیری گیٹ کو بارود سے اڑا لیا تھا۔ اسے ملازمت سے سبکدوشی پر جو زمین عطا ہوئی ہے اس کی آمدنی صرف ۲۵۰ روپے ہے۔ اب عبدالکریم کو چھبیس سال کی عمر میں جو زمین ملی ہے اس کی آمدنی اس مثال والی زمین سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔

وائسرائے نے جی کڑا کر کے لکھا کہ بے شک منشی نے ملکہ کی ایسی ہی خدمت کی ہو گی کہ اسے اس کا مناسب صلہ ملنا چاہئے لیکن جس طرح منشی نے اس زمین کی قدر و قیمت کو کم سمجھا اس پر میں احتجاج کرتا ہوں۔

ملکہ پہلی بار اپنے پیارے عبدل کے اس رویے پر شرمسار ہوئیں۔

فقط تمہاری ماں

بوڑھی ملکہ کے بارے میں لوگوں نے بڑی باتیں بنائیں۔ انہیں پاگل تک کہا گیا۔ البتہ ایک بات جو خود ان کی زندگی میں نہیں مانی گئی لیکن اب ہر ایک تسلیم کرتا ہے وہ یہ کہ وہ ذات پات، اونچ نیچ اور رنگ اور نسل کے معاملے میں امتیاز برتنے کی روادار نہیں تھیں۔ اسی ایک بات پر انہوں نے ایک ہندوستانی مسلمان ملازم کی خاطر جن لوگوں کو للکارا اور جن سے اچھی بھلی لڑائی لڑی ان میں دو وائسرائے، دو وزیراعظم، دو سکریٹری آف اسٹیٹ اور بہت سے دوسرے حکام شامل تھے۔

اس میں شک نہیں کو جوں ہی منشی کو ملکہ کی چاہت اور انسیت کا اندازہ ہوا انہوں نے اپنی ہر جا اور بے جا بات منوائی۔ ملکہ نے بھی ان کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کے تین محل تھے، تینوں میں منشی کے لئے ایک ایک قیام گاہ بنوائی۔ ان میں سے ایک کا نام 'کریم کاٹج' رکھا گیا۔ ملکہ کی وفات کے بعد آگرے جا کر منشی نے اپنے لئے جو کشادہ گھر بنوایا اس کا نام انہوں نے 'کریم لاج' رکھا۔ اس کے علاوہ منشی کے بھائی بھتیجے اور سالے بہنوئی بھی انگلستان پہنچنے لگے۔ سب سے بڑھ کر ان کی اپنی بیگم، ساس اور بعد میں پھوپیاں اور خالائیں بھی اپنے برقعوں سمیت چلی آئیں اور ان کے آتے ہی گھر کی دیواریں اونچی کرا دی گئیں۔

اب مسئلہ ان خواتین کی بیماری دکھی کا تھا۔ منشی کی بیوی تو شاید ذرا سا برقعہ سرکا کر ڈاکٹر ریڈ کو زبان دکھا دیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر ریڈ نے بھی اس سلسلے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ زبان کی سفیدی دیکھتے ہی نسخہ لکھ دیتے تھے۔ لیکن اب جو بن بیاہی لڑکیاں آ گئیں وہ تو کسی غیر مرد کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتی تھیں، نہ کوئی ان کی آواز سن سکتا تھا، نہ کسی کو بتایا جا سکتا تھا کہ اس گھر میں بیری کے درخت اُگ آئے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ریڈ کہتے ہیں کہ انہیں مسز عبدالکریم کی بیماری کی خبر کی جاتی اور جب وہ دیکھنے جاتے تو برقعے میں سے ہر بار ایک مختلف زبان نمودار ہوتی۔

ملکہ منشی کی بیوی کی طرف سے بھی فکر مند رہتیں۔ انہیں یہی تشویش لاحق رہتی کہ اجنبی ماحول اور بالکل مختلف موسم میں ہندوستانی خاتون کو پریشانی نہ ہو۔ ایک بار ملکہ نے اپنی ایک ملازمہ میری میلٹ کو ہدایت کی کہ وہ جا کر منشی کی بیوی سے ملیں۔ اس ملاقات کے بعد میری نے اس کا احوال اپنی والدہ کو لکھا:

"میں ابھی منشی کی بیوی سے مل کر آئی ہوں (شاہی حکم پر)۔ وہ موٹی ہیں اور بد شکل نہیں۔ رنگت تازک سی چاکلیٹی ہے۔ لباس شان دار ہے۔ ان کی انگلیوں میں انگوٹھیاں اور ناک میں بھی چھلے ہیں۔ ان کے ہاتھ کے انگوٹھے پر فیروزے میں جڑا جیبی آئینہ لگا ہے غرض یہ کہ جسم پر ہر طرف لڑیاں، کڑے، چوڑیاں اور بندے نظر آتے ہیں۔ سر پر گلابی رنگ کا دوپٹہ ہے جس کے کناروں پر بھاری سونا ٹانکا گیا ہے۔ ان کا سارا لباس شان دار ریشم اور ساٹن کا ہے۔ تھوڑی سی انگریزی بول لیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ انہیں سردی پسند ہے۔ گھر کے گرد بیس فٹ اونچی ٹٹی باندھی گئی ہے۔ غرض ہر چیز اتنی غیر انگلستانی اور اتنی مشرقی لگی کہ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم شاہی قلعے سے صرف ایک سو گز کے فاصلے پر ہیں۔ یہ تمام باتیں کسی سے کہیے گا نہیں۔ یہ بات احتیاط کے خلاف ہو گی۔ البتہ آنے والے دنوں میں یہی باتیں تاریخ کا دلچسپ حصہ بنیں گی۔"

یہ بات اور یہ پیشین گوئی ۵ نومبر ۱۸۹۳ء کی ہے۔ ملکہ سے نہیں رہا گیا اور ۱۸ نومبر کو وہ خود پیارے عبدل کی بیوی سے ملنے پہنچ گئیں۔ لکھتی ہیں:

'عبدل چھ مہینے کی چھٹی سے حال ہی میں واپس آئے ہیں اور اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی ہندوستان سے واپس لے آئے ہیں۔ وہ خاتون اور ان کی والدہ فروگمور Frogmore کاٹج میں ٹھہری ہیں جس کا میں نے بندوبست کیا ہے۔ میں آج اپنا مکنیل کے ساتھ ان سے ملنے گئی۔ منشی کی بیوی نے قرمزی رنگ کی ساری پہن رکھی تھی۔ دیکھنے میں بھلی لگتی ہے لیکن اتنی شرمیلی ہے کہ اس نے آنکھ نہیں اٹھائی۔'

اس کے بعد ملکہ باقاعدگی سے وہاں آنے جانے لگیں۔ آگرے کی کسی گلی میں رہنے والی برقع پوش خاتون تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ ہندوستان میں مائیں جس ملکہ توریا کے سکّے تعویذ بنا کر بچوں کے گلے میں ڈالتی ہیں، وہی ملکہ جب جی چاہے گا سر اٹھائے ان کے گھروندے میں چلی آئیں گی۔ شوہر نے اسے ملکہ سے اپنے مراسم کے بیسیوں قصے سنائے ہوں گے اور وہ بیچاری یہی سوچ کر چپ رہی ہو گی کہ خاوند کو اس کے منہ پر جھوٹا کہے تو کیونکر۔ لیکن آج جس فروگمور کاٹج کا اس سے نام بھی نہیں لیا جاتا ہو گا، وہاں ملکہ معظمہ کا بنفس نفیس تشریف لانا اس کے لئے کچھ ایسا ہی ہو گا کہ وہ نگاہ بھر کر ملکہ کے چہرے کو بھی نہیں دیکھ پائی۔

ملکہ اس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی، جیسی بھی سہی، اردو میں بات کرتی ہوں گی اور وہ بات ضرور پوچھتی ہوں گی جو عورتیں ہی آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ سکتی ہیں: کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری کوئی اولاد نہیں؟

اور منشی کی بیوی پہلے تو زمین میں گڑ گئی ہو گی لیکن ملکہ کے اصرار پر بڑی مشکل سے گردن کے اشارے سے کہا ہو گا۔ 'سچ ہے۔'

اس کے بچے ہوتے تو وہیں کالج کی بیس فٹ اونچی ٹٹی کے پچھواڑے کھیل رہے ہوتے اور ان سب کے گلے میں تانبے کے سکے پڑے ہوتے اور ان سکوں پر ملکہ ٹوریا کی شبیہ بنی ہوتی۔

اب جو ملکہ وکٹوریا نے منشی حافظ محمد عبدالکریم کو خط لکھا وہ ڈپلو میسی کی ایسی شاہکار تحریر ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ (اور لفظ ڈپلو میسی کا اردو متبادل بھی شاید ہی کہیں ملے، اہل اردو کا یہ کمال ہے کہ جو ہنر انہیں کم آتا ہے، اس کے لئے لفظ بھی کم ہی وضع کرتے ہیں)۔

ونڈسر کاسل۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۹۳

میرے پیارے عبدل،

میں نے تمہاری بیوی کے بارے میں ڈاکٹر ریڈ سے بات کی ہے اور میرا خیال ہے کہ جو کچھ تمہیں بتانا ہے وہ باآسانی سمجھ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی اس کے پیر یا ٹانگ کو ایسی چوٹ آئی ہو کہ اس کے بدن کے اندر کوئی چیز مڑ گئی ہو یا ہل گئی ہو جس کے نتیجے میں چیزوں میں وہ باقاعدگی نہ رہی ہو جو ہونی چاہئے۔

اگر ایسی کوئی بات ہے تو لیڈی ڈاکٹر ہی ہاتھ سے معائنہ (محسوس) کر کے اس کا سبب معلوم کر سکتی ہے۔ ہزاروں عورتوں کو مرد ڈاکٹر سے معائنہ کرانا ہوتا ہے جو دل کو بالکل نہیں بھاتا لیکن اگر معائنہ لیڈی ڈاکٹر کرے تو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے اور اس کے بغیر تم جان بھی نہیں سکتے کہ معاملہ کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کوئی چیز جگہ سے بے جگہ ہو گئی ہو جسے اپنی جگہ واپس بٹھایا جاسکتا ہے جس کے بعد تمہاری ایک بڑی آرزو پوری ہوسکتی ہے۔ تم دونوں کی مدد کے لئے جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا وہ میں کروں گی کیوں کہ تم میرے پیارے ہندوستانی بچے ہو اور تم اپنی ہر بات مجھے بتا سکتے ہو۔ خود میرے نو بچے ہوئے اور اب میں بیٹیوں، بہوؤں، بھانجیوں، بھتیجیوں، نواسیوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔

تمہاری چاہنے والی ماں

وکٹوریا، قیصر ہند [یہ دستخط اردو میں ہیں]

۱۸۹۵ء کے ماہ اکتوبر میں جب صاف ستھری فضا دیکھ کر وائسرائے ہند کی اہلیہ لیڈی لٹن Lytton کو ہندوستان کے پہاڑ یاد آرہے تھے' ملکہ نے پہلی بار ان سے منشی عبدالکریم کی بات چھیڑی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیڈی لٹن نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ ملکہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ منشی اور ان کی بیوی سے ضرور ملیں۔ ان ہی دنوں منشی عبدالکریم کو لارڈ لٹن کے سامنے پیش کیا جارہا تھا۔

یہاں لیڈی لٹن نے اپنی ڈائری میں دو تاریخی جملے لکھے۔ ایک کا تعلق ترک مسلمانوں کے ہاتھوں آرمینیائی مسیحیوں کے قتلِ عام سے اور دوسرے کا ہندوستان میں مسلمانوں کے مسیحی بنائے جانے سے تھا۔ انہوں نے لکھا:

"ملکہ نے کہا کہ اِس تازہ قضیئے میں کچھ قصور آرمینیا والوں کا بھی ہے۔ اُنہوں نے خواہش ظاہر کی کہ عیسائی مبلغ مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، اُور بہت سی باتیں کیں جن سے میں متفق ہوں لیکن کچھ عندیہ ملا کہ ملکہ نے اس بارے میں منشی سے بھی تبادلہ خیال کیا، یہ بات خطرناک ہے۔"

یہ وہی دن تھے جب محل میں یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ مسلمانوں کی جانب ملکہ کا جھکاؤ بڑھتا جارہا ہے اور ہو نہ ہو، یہ سب منشی کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

بہر حال ملکہ کی خوشنودی کی خاطر لیڈی لٹن تیسرے ہی دن منشی اور ان کی بیوی سے ملنے ان کے گھر گئیں۔ پھر انہوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

"وہ چھوٹی سی اچھی سی خاتون ہیں' ان کا دیسی لباس اور زیورات بہت پیارے ہیں۔ کچھ دیر بعد منشی بھی سرشاری کے عالم میں آئے اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے ہم نے تھاما، لیکن وہ بیٹھے نہیں اور ہم زیادہ دیر ٹھہرے بھی نہیں۔ میں نے ان کی کتاب میں اپنا نام لکھا، کتاب میں بہت سے شاہی مہمانوں نے اپنے نام لکھے تھے۔ سوچتی ہوں وہ اپنے گھر والوں کو ہم لوگوں کے بارے میں کیا لکھتے ہوں گے۔ ملکہ اب انہیں اپنا انڈین سکریٹری کہتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی ان ناز برداریوں کو سہار نہیں پائیں گے۔"

جس کتاب میں بہت سے شاہی مہمانوں نے اپنے نام لکھے تھے، وہ خاک میں ملادی گئی اور جو خط منشی اپنے گھر والوں کو لکھتے ہوں گے، وہ راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دیئے گئے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

البتہ ایک بات یہیں واضح کرنا مناسب ہوگا۔ منشی حافظ محمد عبدالکریم کے بارے میں ہمیں جتنی بھی معلومات ملتی ہیں، یا تو ملکہ کی ڈائری اور چند بچے کھچے خطوں سے یا پھر منشی کے شدید مخالفوں کے روزناپچوں سے۔ خود عبدالکریم نے کیا دیکھا، کیا سنا، کیا محسوس کیا، اس بارے میں خود ان کا کوئی بیان کہیں نہیں ملتا اور نہ کبھی ملے گا۔

اُن ہی دنوں ملکہ کے ملازمینِ خاص منشی کی دشمنی پر تلے ہوئے تھے اور اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کہیں سے ان کے خلاف کچھ گولہ بارود ہاتھ لگے اور ان کو ملکہ کی نگاہوں سے گرایا جائے، چنانچہ انہوں نے وائسرائے ہند کو لکھ کر جہاں اَور باتیں دریافت کیں وہیں یہ بھی لکھا کہ معلوم کیا جائے کہ اس کی بیوی کس نوعیت کی عورت ہے اور اس کی کتنی بیویاں ہیں؟

جواب آیا: بیوی کے بارے میں اور بیویوں کی تعداد کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بیوی تمام عمر ایک ہی بن کر رہی۔ اولاد اس کے ہاں نہ ہونی تھی، نہ ہوئی۔ آخر دونوں نے مل کر منشی کے ایک بھتیجے مٹھو میاں کو گود لیا جن کا اصل نام محمد عبدالوحید تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت سنہ ۴۷ء میں وہ آگرے سے ہجرت کر کے بال بچوں سمیت پاکستان چلے گئے اور سنہ ۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں منشی عبدالکریم کی کہانی میں ایک نیا کردار داخل ہوتا ہے۔

ایک اَور منظورِ نظر

منشی کو محل میں آئے تین چار برس گزر چکے تھے۔ ملکہ سے ان کی قربت بہت بڑھ چکی تھی۔ اب وہ وکٹوریا کی اجازت سے کبھی کبھی لندن جانے لگے تھے جہاں وہ اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کررہے تھے۔

وہاں سے لوٹ کر وہ ملکہ کو اپنی شہر گردی کی داستانیں سناتے ہوں گے اور بتاتے ہوں گے کہ کیسے کیسے لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی اور لوگ کیا سوچ رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں۔

غدر کی گرد بیٹھ چکی تھی، کابل میں انگریزوں کے قتلِ عام کے بادل چھٹ چکے تھے، لیکن برصغیر میں آزادی کی گھٹا اب اٹھنے کو تھی۔ سوراج کا نعرہ اب بلند ہونے کو تھا۔ لندن آئے ہوئے ہندوستانی نوجوان برطانیہ کی سیاست میں داخل ہونے لگے تھے۔ وہ اس راستے ہندوستان میں خود ہندوستانیوں کو ان کے سیاسی حقوق دلانا چاہتے تھے۔

منشی عبدالکریم شام کو لوٹ کر ملکہ کو یہ تمام باتیں سمجھاتے ہوں گے۔ باتوں باتوں میں پونا کے ہونہار نوجوان رفیع الدین احمد کا ذکر آیا ہوگا اور کچھ اس انداز میں آیا ہوگا کہ ملکہ نے ان سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا ہوگا۔

جس فرماں روا سے ملاقات کے لئے ملک کے بڑے بڑے سیاست داں تین تین روز انتظار کرتے تھے، اس سے ملوانے کے لئے منشی ایک روز رفیع الدین کو ہمراہ لیتے آئے۔ یہ بات غالباً 1891 کی ہے۔ ان دنوں وہ کوئی ۲۶ برس کے ہوں گے۔ وہ دکن کالج، پونا کے پڑھے ہوئے تھے اور چونکہ انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے برطانیہ آکر قانون پڑھنا چاہتے تھے۔ ملکہ کے حضور وہ جب رواں انگریزی اور شستہ اردو بولے ہوں گے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مسلمانوں کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہوگا تو ملکہ دیر تک ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی ذہانت کی داد دیتی رہی ہوں گی۔

اہلِ دربار دیکھا کئے اور ایک اَور ہندوستانی قیصرِ ہند کا منظورِ نظر ہوگیا۔ رفیع الدین احمد اور منشی عبدالکریم جب دیر تک بند ایوانوں میں بیٹھے مشورے کرتے ہوں گے تو باہر غلام گردشوں میں آتے جاتے اہلِ دربار کے دلوں

پر جو گزرتی ہوگی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اہلِ دربار منشی کی طرح رفیع الدین کے بھی دشمن ہوگئے۔

لندن آکر پہلے انہوں نے کنگز کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۸۲ء میں بیرسٹر بنے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے لہٰذا پال مال گزٹ، بلیک اینڈ وہائٹ اور اسٹرینڈ میگزین جیسے بڑے رسالوں میں لکھنے لگے اور صحافی کہلائے۔

اب رقابتیں شروع ہوئیں۔ حکام کو ایک ہی کام آتا تھا جو وہ کر گزرے۔ انہوں نے پولیس کو رفیع الدین احمد کے پیچھے لگا دیا۔ دیکھنا یہ شخص ہندوستان میں باغیوں سے ملا ہوا ہے۔ ذرا پتہ کرنا یہ شخص کابل کے دربار کا جاسوس ہے۔ بات اتنی بڑھی کہ لندن کی پولیس کے سربراہ سر ارنسٹ بریڈفورڈ نے تفتیش شروع کردی یہاں تک کہ منشی عبدالکریم پر بھی نگرانی لگادی گئی۔ ان کے بارے میں بھی پولیس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے 'شر پسندوں' سے ملے ہوئے ہیں۔

۱۸۹۲ء کا کرسمس قریب تھا۔ رسالوں کے شاندار شمارے نکل رہے تھے۔ ان ہی دنوں رفیع الدین احمد کے ایک مضمون نے دھوم مچادی۔ مشہور جریدے اسٹرینڈ میگزین میں انہوں نے ملکہ کے بارے میں اپنی تحریر شائع کرائی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ وکٹوریا کے مزاج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جس بات نے تہلکہ مچایا وہ یہ تھی کہ اس مضمون کے ساتھ ملکہ کی ذاتی ڈائری کا عکس اور ملکہ کی تصویر بھی شائع ہوئی اور لکھا گیا کہ یہ تصویر خود ملکہ عالیہ نے بطور خاص مصنف کو مرحمت فرمائی ہے۔ مضمون میں مصنف کو "ایک سرکردہ ہندوستانی اسکالر" لکھا گیا۔ اور یہ بھی لکھا گیا کہ "ہر مجسٹی نے ازراہ عنایت اپنی ڈائری سے دو صفحات خاص طور پر اس مضمون کے لئے نقل کرکے دیئے ہیں"۔ رفیع الدین نے ملکہ کی ڈائری کو ہندوستانی روزنامچے کا نام دیا۔

مضمون میں لکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریا کو ان کی رعیت کے علاوہ لاکھوں دوسرے لوگ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ برطانیہ عظمیٰ کی فرماں رواں ہیں بلکہ ان میں سیاسی، اخلاقی اور مدبرانہ صلاحتیں بدرجہ اتم یکجا ہیں جو قدرت اپنے مخصوص بندوں کو عطا کرتی ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر ان کی غیر معمولی ذہانت ہے۔ ان کا بے پناہ علم، ان کی خوش خلقی اور سادگی اور ان کی پرمغز اور منطقی گفتگو ہمیں سب سے زیادہ حیران کرتی ہے۔ اور اب جو انہوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کا تازہ مظاہرہ کیا ہے اس نے تو ادب کی جستجو کی ان کی پچھلی کاوشوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ملکہ عالیہ اپنی بے شمار مصروفیات میں سے وقت نکال کر ایک مشرقی زبان سیکھ رہی ہیں اور گزشتہ تین برسوں میں اتنی پیش رفت کرچکی ہیں کہ اب ہندوستانی زبان میں اپنا علیحدہ روزنامچہ لکھ رہی ہیں۔

مضمون میں لکھا تھا کہ بلاشبہ مسٹر گلیڈسٹن اس ضعیفی میں تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں لیکن اس خاتون فرماں رواں نے اس عمر میں ایک ایسی نئی زبان پر عبور حاصل کرلیا ہے جو یورپ میں رہنے والوں کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ اس کے علاوہ ملکہ نے مشرق کے فلسفے کے تمام رموز سمجھ لئے ہیں، وہ اپنی مشرقی رعایا کے جذبات واحساسات کو ان کی اپنی زبان میں پڑھتی ہیں اور اپنا روزمرہ کا احوال اپنی اس نئی زبان میں تحریر کرتی ہیں۔ جس سرعت اور مہارت سے وہ یہ زبان سیکھ رہی ہیں وہ حیرت انگیز ہے۔ کام کا بوجھ ہو یا پریشانی، غم ہو یا رنج، ہندوستانی زبان بے حد پابندی سے سیکھتی ہیں۔ اگر ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے اور مصائب سر اٹھائیں تب بھی وہ مقررہ وقت پر اپنی ہندوستانی ڈاری لکھنا ترک نہیں کرتیں۔ یورپ کی تاریخ میں پہلی بار کسی بڑی مملکت کے فرماں رواں نے مشرقی ادب سے اتنی سنجیدگی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا ہے۔

اپنے اس مضمون میں رفیع الدین احمد نے ملکہ کے ساتھ ساتھ ان کے اتالیق کو بھی جی بھر کر خراج تحسین پیش کیا اور ان کی ان تھک محنت اور لگن کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

یہ مضمون لکھ کر اور اس کے ساتھ ملکہ کی ڈائری کا ورق شائع کرا کے رفیع الدین نے اپنے حاسدوں پر دو باتیں واضح کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے ملکہ سے بہت قریب رہ کر ان کی شخصیت کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے باشندوں اور ان کی زبان سے جیسا لگاؤ ملکہ کو ہے، ان کے درباریوں کو نہیں۔ وہی درباری جن کے سینے پر ابھی تک ایک نچلی ذات کا منشی سانپ بن کر لوٹ رہا تھا کہ اچانک کہیں سے کہ امیر کابل کا ایک جاسوس بھی آن دھمکا۔

خود ملکہ کو اپنے منشی کے اس دوست سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ ۶ جولائی ۱۸۹۳ء کو ڈیوک آف یارک (جارج پنجم) کی شادی میں رفیع الدین احمد بھی مدعو تھے۔ اس کے علاوہ اسی برس ملکہ نے شاہی مصور Swoboda کو رفیع الدین کی تصویر بنانے کا حکم دیا۔ یہ تصویر آج بھی موجود ہے اور اگر مصور نے دیانت داری سے بنائی ہے اور مبالغے سے کام نہیں لیا ہے تو یقین ہوتا ہے کہ رفیع الدین کے چہرے بشرے سے بلا کی ذہانت ٹپکتی ہوگی۔ وجاہت اور جاذبیت اس کے علاوہ رہی ہوگی۔

لندن کے چوٹی کے رسالوں میں رفیع الدین احمد کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اب جو انہوں نے اپنے دوست منشی عبدالکریم کی تعریفیں لکھیں تو غضب ہوگیا۔ ابھی ابھی ملکہ نے منشی کے سینے پر سی آئی ای کا تمغہ آویزاں کیا تھا اور اس طرح انہیں کمپینئن آف دی آرڈر آف دی انڈین امپائر کے خطاب سے نوازا تھا۔ اسی نسبت سے رفیع الدین احمد نے تفصیل سے لکھا کہ منشی کون ہیں۔

اس پر سر جان ٹائیلر Tyler، جو صوبجات شمال مغربی کے گورنر رہ چکے تھے اور جنہوں نے آگرے میں منشی کو برطانیہ بھیجنے کے لئے بھرتی کیا تھا، برہم ہوگئے اور انہوں نے ملکہ کے ذاتی معالج ڈاکٹر ریڈ Reid سے کہا:

ملکہ نے منشی کو سی آئی ای دے کر بھاری غلطی کی ہے۔ وہ بہت گھٹیا حسب نسب کا آدمی ہے، اس کی تعلیم تک نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی ایک معمولی خدمت گار سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا اور اسی حیثیت سے وہ ہندوستان سے بھیجا گیا تھا۔ اب اسے جنٹلمین قرار دینے کا خیال ان لوگوں کے لئے نہایت مہمل ہے جو اس سے واقف ہیں۔ اس دوران رفیع الدین احمد نے اس کے بارے میں رسالہ بلیک اینڈ وہائٹ اور دوسرے جریدوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہر لحاظ سے جھوٹ ہے۔ یہ شخص کہ نام جس کا رفیع الدین احمد ہے، زیرک لیکن بے اصولا اور خطرناک ہے جسے کسی بھی سبب اور جواز کی بنا پر کسی بھی محل میں داخلے کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔ یہ شخص منشی کو آلہ کار بنا کر اپنے کام نکالتا ہے اور جس روز اس کا کام نکل جائے گا، دیکھنا کہ منشی کے راز فاش کرنے اور اسے عوام کی نگاہوں سے گرانے والا پہلا شخص یہی ہوگا اور یہ کام اس کے لئے مشکل بھی نہ ہوگا۔

وقت نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، اتنا ضرور کیا کہ سر جان ٹائیلر کو غلط ثابت کر دکھایا۔

ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئے نو دس سال گزر چکے تھے۔ برطانیہ کی لبرل پارٹی کو کانگریس سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ اس نے سنہ ۱۸۹۳ کے برطانوی انتخابات میں ایک سرکردہ ہندوستانی پارسی دادا بھائی نوروجی کو کھڑا کیا اور پانچ ووٹوں کی اکثریت سے سہی، کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ اب سنہ ۱۸۹۵ کے انتخابات میں نوروجی کو نیچا دکھانے کے لئے قدامت پسندوں کو ایک ہندوستانی امیدوار کی تلاش تھی۔ ان کا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف تھا جنہیں وہ ”ہندوستانیوں کی نفیس اور مہذب جمعیت“ کہتے تھے۔

ان کی نگاہ رفیع الدین احمد پر پڑی جو کچھ تو اپنی تحریروں کی وجہ سے اور بیرسٹر بن جانے کے باعث لوگوں کی نگاہ میں آ گئے تھے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ کانگریس کی مخالفت میں مسلم پٹریاٹک لیگ قائم کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں وہ سر سید احمد خاں کے ہم خیال تھے جنہوں نے سنہ ۸۸ میں یہ کہہ کر انڈین پٹریاٹک ایسوی ایشن قائم کی تھی کہ کانگریس سارے ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے اور یہ کہ اس کے حامی انگلستان میں غلط تاثر قائم کر رہے ہیں۔

اپنی مسلم پٹریاٹک لیگ کی وجہ سے رفیع الدین احمد کنزرویٹیو پارٹی سے اور بھی قریب ہو گئے جس نے انہیں اپنا امیدوار قرار دے کر ان کے حق میں انتخابی مہم شروع کر دی۔ لندن کے جونئر کانسٹی ٹیوشنل کلب میں ایک خصوصی ضیافت کے دوران سرکردہ قدامت پسند سر جان گورسٹ Gorst نے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

برطانیہ کے ایک اخبار میں مولوی محمد برکت اللہ کا خط چھپا جس میں انہوں نے برطانوی عوام سے اپیل کی کہ وہ رفیع الدین احمد کو کامیاب کرائیں۔ انہوں نے لکھا کہ اس سے ہندوستانی مسلمان بے حد مسرور ہوں گے۔ ایک برطانوی جریدے نے اپنے اداریے میں لکھا کہ اب اہل برطانیہ کو احساس ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں صرف بنگالی بابو اور کانگریسی جنٹل مین ہی پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر اپنے وقت کے سب سے زیادہ با اثر اینگلو انڈین اخبار ٹائمز آف انڈیا نے رفیع الدین احمد کی نامزدگی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس نے لکھا کہ ہم تو ہندوستان میں مذہبی تفرقہ مٹانے کے لئے جان دیئے دے رہے ہیں اور آپ انگلستان میں اس بٹوارے کو اور اچھال رہے ہیں۔ اخبار نے لکھا کہ برہمن آگے نکلے جارہے ہیں یا مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں ہو رہا ہے، یہ معاملہ برطانیہ کی جماعتی سیاست کا موضوع نہ بننا چاہئے۔ اخبار نے مزید لکھا کہ رفیع الدین احمد پارلیمان میں کوئی کارآمد خدمت انجام نہیں دے سکتے کیونکہ وہ اسی ذات پات اور دین دھرم کی منافرت کے راستے میدان میں اترے ہیں جو وہ اپنی سرزمین پر چھوڑ کر آئے ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی۔ کنزرویٹیو پارٹی نے، جو اس وقت یونینسٹ پارٹی کہلاتی تھی، نہایت خاموشی سے رفیع الدین احمد کا نام واپس لے لیا۔

اور جب ۳۱ دسمبر ۱۹۰۶ کو ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اخبار انگلش مین میں اسے سب سے پہلے سراہنے والوں میں رفیع الدین پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کی تحریک آزادی کی کتابوں میں اب ان کا ذکر تک نہیں۔

اِدھر حاسدوں نے جا جا کر ملکہ کے کان میں پھونکنا شروع کیا کہ ہندوستان کے شورش پسندوں کے ہم خیال رفیع الدین احمد نے لندن میں اپنی جماعت قائم کی ہے اور آپ کے چہیتے منشی عبدالکریم بھی اس میں ملوث ہیں۔ ملکہ پر ان باتوں کا اثر ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ کیا مسلم پیٹریاٹک لیگ کے قیام پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا؟ انہوں نے منشی کو سخت تنبیہ کیوں نہیں کی؟ اس سارے خرابے کے بعد انہوں نے رفیع الدین کا محل میں داخلہ کیوں بند نہیں کیا؟ یہ بات غور طلب ہے۔

کیا ملکہ اس سارے معاملے کا خاموشی سے جائزہ لے رہی تھیں؟ اور کیا اب وہ رفیع الدین پر کچھ اور عنایات کرنا چاہتی تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۸۹۵ کے موسم خزاں میں وکٹوریا نے وزیراعظم کو سفارشات بھیجنی شروع کیں کہ برطانیہ کی سفارت کاری میں انقلاب لایا جائے۔ انہوں نے پوچھا کہ 'کیوں نہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے سے کسی مسلمان کو وابستہ کیا جائے'۔ اور اس منصب کے لئے ملکہ نے خود ہی ایک نام تجویز کیا۔ رفیع الدین احمد کا نام۔ ان کا کہنا تھا کہ ترکوں پر سختی کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھنا

ضروری ہے۔ یہ کام کیسے کیا جائے، اس کا علم رفیع الدین کو بخوبی ہوگا۔ اس بات کی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ سن ۹۳ کے لگ بھگ جب برطانیہ اور ترکی کے تعلقات خراب تھے، رفیع الدین کی خدمات دو مرتبہ حاصل کی گئیں اور وہ دفتر خارجہ کے تعارفی خط لے کر قسطنطنیہ گئے اور سلطان عبدالحمید سے شرف باریابی حاصل کیا۔ اسی بات کو سراہتے ہوئے ملکہ نے رفیع الدین کو وہاں کی سفارت پر بھیجنے کی سفارش کی۔

پورا یورپ ترکی کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ الزام یہ تھا کہ ترک آرمینائی باشندوں پر ظلم توڑ رہے ہیں۔ بوڑھے گلیڈسٹن بھی کہیں سے برآمد ہوئے اور ترکی کی مذمت کرنے لگے۔ ملکہ اس بار بھی بولیں کہ یہ مسٹر گلیڈسٹن کی نیم دیوانگی ہے۔ انہوں نے سلطان کو جو خط لکھے ان کا لب ولہجہ بے لاگ لیکن دوستانہ تھا۔

رفیع الدین احمد کو سفارتی خدمات انجام دینے کے لئے ترکی بھیجنے پر جب ملکہ کا اصرار بڑھا تو وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے جواب دیا کہ مسٹر احمد اس منصب کے اہل ضرور ہیں لیکن کیا موزوں بھی ہیں؟ اس پر ملکہ نے زور دے کر کہا کہ آپ رفیع الدین سے خود مل کر دیکھیں کہ وہ کتنے موزوں شخص ہیں۔ ۲۳ اکتوبر کو رفیع الدین کا انٹرویو ہوا۔ ساری گفتگو مذہبی رواداری تک محدود رہی۔ ملکہ پھر بھی پیچھے پڑی رہیں۔ آخر وزیر اعظم نے کہا کہ وہ احمد کو بخوشی ملازمت دے دیں گے لیکن حکومت میں ان کے خلاف جو منافرت پائی جاتی ہے وہ مختلف مذاہب کے معاملات سے نمٹنے والی دوسری حکومتوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔

اسی دوران ہندوستان کے محکمہ ٹھگی و ڈکیتی نے ایک یادداشت مرتب کی جس میں لکھا تھا: سردار نصر اللہ خان جب انگلستان گئے تو انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم پانے والے مسٹر رفیع الدین سے مل کر یہ بندوبست کیا کہ وہ بلبل بازار، کلکتہ کے غلام محی الدین کو اطلاعات بھیجا کریں جو ہندوستان میں امیر کابل کے لئے معلومات اکٹھا کیا کرتے ہیں۔ تو اس طرح بعض نہایت غیر معمولی کہانیاں انگلستانی محلوں سے نکل کر دربار کابل تک پہنچ رہی ہیں، اوپر سے یہ کہ یہ غذا جس قسم کے لوگوں کے لئے بھیجی جاتی ہے ان کے ذائقے کی مناسبت سے اس میں نمک مرچ شامل کیا جاتا ہے۔ انگلستان سے متعلق ہر چیز سے ان کہانیوں کے مصنف کو جو نفرت ہے وہ ان سے صاف عیاں ہے۔ خفیہ پولیس بھی اس جنٹل مین سے خوب واقف ہے۔ جس کے بارے میں یقین ہے کہ اس نے ملکہ کے منشی سے مراسم خوب بڑھا رکھے ہیں۔

۱۸۹۷ کے موسم بہار میں یہ ہوا کہ کھولتا ہوا لاوا ابل پڑا۔ ملکہ وکٹوریا چھٹیاں منانے فرانس جا رہی تھیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ منشی عبدالکریم کو بھی ساتھ لے جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھانے کی میز پر اہل خاندان اور شرفاء اور امراء کے ساتھ منشی بھی بیٹھیں گے۔ اس پر تو ایک آفت مچ گئی۔ یہ لوگ آپے سے باہر

ہو گئے اور ملکہ کی ذاتی سکریٹری کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ جا کر ملکہ کو الٹی میٹم دیں اور کہیں کہ کھانے کی میز پر یا تو منشی بیٹھیں گے یا محل والے۔

یہ بات سنتے ہی ملکہ آگ بگولا ہو گئیں۔ اس عمر میں انہیں طیش کم آتا تھا لیکن اس روز انہوں نے اپنی میز پر چنی ہوئی چیزیں دور اچھال دیں۔ آخر وزیر اعظم کو طلب کیا گیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں ملکہ کو سمجھایا کہ برطانیہ کی بات اور ہے۔ فرانس والے عجب بے ڈھب لوگ ہیں۔ وہ منشی کی پوزیشن کو نہیں سمجھ پائیں گے اور ممکن ہے بد اخلاقی کا مظاہرہ کریں۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ملکہ کے جلو میں جو فوج ظفر موج جانب فرانس چلی اس میں منشی شامل نہیں تھے۔

لیکن پھر کیا ہوا۔ چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ لوگوں نے دیکھا، منشی نہ صرف اپنا ساز و سامان اٹھائے چلے آرہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کے یار جانی رفیع الدین احمد بھی ہیں۔

اب تو اہل دربار نے تلواریں سونت لیں۔ چند ایک تو مارنے مرنے پر تل گئے کہ یہاں فرانس میں کابل کے اس جاسوس کا کیا کام۔ اس کے ساتھ ہی رفیع الدین کو واپس بھیجنے کی جنگ شروع ہو گئی۔ منشی بے چارے اِدھر کے پیغام اُدھر اور اُدھر کے جواب اِدھر پہنچاتے۔ بالآخر رفیع الدین کو اڑتالیس گھنٹے کے نوٹس پر جانا پڑا اور جب کسی اور پر بس نہ چلا تو وہ جاتے جاتے منشی ہی پر برس پڑے۔

اس کے ساتھ ہی تمام ہندوستانی حکام کو خفیہ زبان میں پیغامات بھیجے گئے کہ ذرا معلوم تو کریں کہ ان دونوں حضرات کی حقیقت کیا ہے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ ملک کے ہندو اخباروں میں دیکھا جائے کہ ان کے خلاف کچھ لکھا جا رہا ہے یا نہیں۔

تین دن بعد سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ جارج ہملٹن نے وائسرائے کو لکھا کہ ممکن ہے منشی کے دوست رفیع الدین احمد کا چال چلن مشکوک ہو لیکن میں منشی کے بارے میں کوئی نئی تفتیش شروع کرنے سے انکار کرتا ہوں کیونکہ ان کے خلاف کوئی شہادت نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا کہ فرانس میں یہ جو چھوٹا سے طوفان اٹھا، اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد منشی کا اثر و نفوذ کم ہوتا جائے گا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ہملٹن کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ اس آخری راؤنڈ میں ملکہ ہار گئیں۔ لیکن وائسرائے کے نام ہملٹن کے خط کے پوسٹ اسکرپٹ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اگر ملکہ پیچھے ہٹ گئی ہیں تو یہ ضرورت کا تقاضا نہیں بلکہ چال ہے۔ انہوں نے لکھا:

"میرا خیال ہے کہ آپ عام معاملات پر ملکہ کو جو کچھ چاہیں پوری آزادی سے لکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک

میں جانتا ہوں، ہم جو کچھ ان سے کہتے ہیں یا انہیں لکھتے ہیں وہ بات منشی تک نہیں پہنچتی۔ کاغذات تک اس کی رسائی ضرور ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسا کرتا ہے۔"۔

بیشتر مورخ مانتے ہیں کہ منشی عبدالکریم بے ضرر تھے۔ ۱۸۹۷ء کے موسم خزاں تک خود ملکہ نے اعلان کیا کہ رفیع الدین احمد کو اب 'سلامتی کے لئے خطرہ' تصور نہیں کیا جا رہا ہے۔

وہ نہایت باکمال خاتون تھیں۔ جوں ہی انہیں اپنی ڈائمنڈ جوبلی کی مصروفیات سے فرصت ملی، وزیر اعظم کے نام ان کے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ پہلے تو انہوں نے منشی کا اور اپنا دامن صاف کیا اور لکھا کہ میں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتی ہوں کہ کسی طرح کی کوئی سیاسی دستاویز کبھی منشی کے ہاتھ میں نہیں گئی۔ کبھی کوئی لفظ مجھ سے نہیں پڑھا جاتا تو وہ اس کے پڑھنے میں میری مدد کرتا ہے یا پھر روزمرہ کے عام کاغذ دستخط کے لئے میرے سامنے رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ منشی کی انگریزی کی استعداد اتنی نہیں کہ یہ زبان روانی سے پڑھ سکے اور اہمیت کی حامل کوئی چیز آسانی سے پڑھ لے۔

اس کے بعد ملکہ نے رفیع الدین احمد کا معاملہ اٹھایا۔ پہلے تو انہوں نے مارے باندھے وزیر اعظم سے وعدہ کیا کہ اب رفیع الدین محل میں بن بلائے نہیں آئیں گے کیونکہ وہ صحافی ہیں اور مختلف قضیوں میں ان کو دخل ہے، لیکن جولائی ۱۸۹۷ء کے خاتمے تک انہوں نے وزیر اعظم پر زور دینا شروع کیا کہ رفیع الدین کو ملازمت دیں اور دنیا میں مسلمانوں کے حالات پر نگاہ رکھنے کا کام انہیں سونپیں جو حکومت کے لئے بہت کام کی چیز ہوگی۔ ملکہ نے لکھا کہ بے داغ کردار کے لوگوں کو اطلاعات حاصل کرنے کے کام پر اکثر لگایا گیا ہے۔

ملکہ نے یہ بھی لکھا کہ آکسفورڈ کے سرکردہ پروفیسر جوٹ Jowett نے رفیع الدین کا نام تجویز کیا ہے اور آخر میں لکھا: 'انہیں مشکوک شخص تصور کر کے ہم نے بہت برا کیا کیونکہ اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں'۔

اس کے بعد انہوں نے وزیر اعظم سے اصرار شروع کیا رفیع الدین کو جس طرح فرانس سے نکالا گیا تھا اس پر ان سے معافی مانگیں اور ان سے کہیں کہ یہ سب کچھ ان کے صحافی ہونے کی وجہ سے کیا گیا تھا ورنہ خود ملکہ ان سے نہ تو ناراض تھیں اور نہ انہوں نے اپنی کسی بات سے ملکہ کو خفا کیا تھا۔ یہ بات اگست کی ہے۔ ستمبر تک خود وزیر اعظم نے ملکہ کو بتایا کہ رفیع الدین پر کئے جانے والے سارے شکوک و شبہات بے سبب تھے۔

اگلا برس، یعنی ۱۸۹۸ء ملکہ نے دونوں کے ناز اٹھانے میں گزارا۔ وہ منشی کی فرمائش پر اس موسم بہار میں رفیع الدین احمد کو اپنے ساتھ فرانس لے جانا چاہتی تھیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی)۔ وہ رفیع الدین کو جوبلی

میڈل دینا چاہتی تھیں لیکن وزیر اعظم سالسبری نے مشورہ دیا کہ ذرا ٹھہریں۔ ملکہ نے اصرار کیا کہ فرانس سے نکالے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں شاہی رقص کی تقریب میں نہ بلایا جائے جس میں پہلے دو مرتبہ مدعو کئے جا چکے تھے۔ اسی طرح انہیں ڈیوک آف یارک کی شادی میں بلانے پر بھی اصرار کیا گیا۔ جواز اس کا ملکہ نے یہ پیش کیا کہ اگر رفیع الدین کو ان تقریبات سے پرے رکھا گیا تو عالم اسلام یہی کہے گا کہ ترکی کے سلطان نے آرمینیائی باشندوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں، ہم ان کا سیاسی انتقام لے رہے ہیں۔

ان ہی دنوں آغا خان ملکہ سے ملنے آرہے تھے۔ ملکہ نے خاص طور خیال رکھا کہ وہ منشی عبدالکریم سے ملاقات کریں، لیکن راہ میں ان کے ساتھ سفر کرنے والے انڈیا آفس کے ایک اہل کار نے خدا جانے ان کے کان میں کیا پھونکا کہ انہوں نے منشی کو اپنے ہاں مدعو نہیں کیا۔ جب ملکہ کو پتہ چلا کہ آغا خان سے کہا گیا ہے کہ منشی معمولی شخص ہے، وہ جنٹل مین نہیں ہو سکتا تو وہ بھڑک اٹھیں اور بولیں کہ بڑودا کا گائیکواڑ چرواہا تھا، جب وہ شہزادہ بن سکتا ہے تو منشی نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ انہوں نے پھر آرچ بشپ کی مثال دی جن کے باپ قصاب تھے۔ اور پھر انہوں نے آنجہانی سر ولیم جینر Jenner کا قول دہرایا کہ اگر ملکہ کسی خاکروب کو بھی اعلیٰ منصب دیتی ہیں تو کسی کو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کا اختیار نہیں۔

اسی دوران لارڈ کرزن نئے وائسرائے بنے تو ملکہ نے یہ بات ان پر اچھی طرح واضح کر دی کہ منشی کے بارے میں کسی کی بات پر کان نہ دھریں۔ اور جب لارڈ کرزن کے بارے میں انہوں نے سنا کہ وہ ہندوستان میں ایک محمڈن کالج کی تعمیر کے حق میں ہیں تو ملکہ خوشی سے جھوم اٹھیں اور یہ کہہ کر اپنی حمایت کا یقین دلایا کہ اگر اس کے جواب میں کسی ہندو کالج کے لئے بھی کچھ دینا پڑے تو یوں ہی سہی۔ ”یہ الگ بات ہے کہ ہندوؤں کے پاس بہت ہے، انہیں کسی مدد کی ضرورت نہیں“۔

قیصر ہند کے ذہن میں یہ باتیں کیوں کر جگہ پا رہی تھیں؟ یہ بات غور طلب ہے۔

ملکہ کے انتقال کے بعد رفیع الدین احمد ہندوستان لوٹ گئے اور مولوی رفیع الدین کہلائے۔ ۱۹۰۹ء میں انہیں بامبے کونسل کا رکن منتخب کیا گیا۔ پھر مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نتیجے میں وہ ۱۹۲۸ء میں حکومتِ بمبئی کے وزیر تعلیم بنے۔ چار سال بعد انہیں بادشاہ نے تاج برطانیہ کے لئے ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر سر کا خطاب دیا۔ سر رفیع نے اپنی زندگی کے آخری بیس برس پونا میں گزارے جہاں وہ ہر آنے جانے والے کو ملکہ وکٹوریا کے دربار میں اپنی نوجوانی کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں وہ اس دربار میں جا پہنچے جہاں سے لوٹ کر آج تک کسی نے کوئی قصہ نہیں سنایا۔

سب کہنے کی باتیں ہیں

یہ بات طے ہے کہ جیسے جیسے منشی کی مخالفت بڑھی، ملکہ ان کے گرد اپنا حصار اونچا کرتی گئیں۔

محل میں سخت حکم تھا کہ ہندوستانیوں کو 'کالے آدمی' نہ کہا جائے، چنانچہ ایک بار وزیر اعظم کو معافی مانگنی پڑی کیونکہ وہ اہل ہند کے بارے میں ایسے الفاظ اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔

1891ء میں ہندوستان میں گوروں کا قتلِ عام ہوا تو ملکہ نے قاتلوں کے سرغنے کو پھانسی سے بچانے کی ناکام کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح کی سختی سے کچلنے کی تدبیر اب نہیں چلنے کی۔ وہ اردو سیکھنے پر یوں مسرور تھیں کہ اب وہ مہارانیوں سے خود ان کی زبان میں بات کر سکیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انگریز لیڈیز بھی یہی کریں تو آئندہ کوئی قتل عام نہیں ہوگا۔

مسیحی پادریوں سے انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ مسلمانوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور نہ کریں۔ پادریوں کو بھی ملکہ کے ان احساسات کا بخوبی اندازہ تھا چنانچہ وہ ملکہ سے کہا کرتے تھے کہ آدمی غیر مسیحی رہ کر بھی اپنے اندر یسوع مسیح کی روح پیدا کر سکتا ہے۔

منشی ان کو ہندوستانی پڑھاتے تھے تو ملکہ کہا کرتی تھیں کہ وہ نہایت سخت ماسٹر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی منشی ان کو عمرانیات اور دینیات کا درس بھی دے رہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہندوستان کے ایک گورنر کی بیوی سے اصرار کیا کہ اگر بیوائیں الگ تھلگ رہتی ہیں تو رہنے دیں اور ان کے معاملات میں دخل نہ دیں اور ان کے شوہروں کو اتنی زیادہ تعلیم بھی نہ دلوائیں کہ وہ یورپ کا قابل اعتراض ادب پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔

منشی پانچ برس سے ان کے پہلو سے لگے یوں ہی تو نہیں کھڑے تھے۔

ایک بار ملکہ نے طے کیا کہ جیسے بھی بنے ہندوستانی عورتوں کو زچگی کے دوران مرنے سے بچایا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ ایک منصوبہ بنایا۔ 1900ء میں انہوں نے خاتون ڈاکٹروں کو پانچ قیصر ہند تمغے دیئے اور ہندوستان میں میڈیکل اسکولوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر وہ یہ جان کر نہایت مسرور ہوئیں کہ بہت

سے ہندوستانی جس شہر میں علاج معالجے کی تربیت پا رہے ہیں وہ ان کے منشی کا آبائی شہر آگرہ ہے۔ ۱۸۹۸ء میں انہوں نے شکایت کی کہ ان کی سال گرہ پر اعزاز پانے والوں کی فہرست میں ہندوستانی بہت کم ہیں۔

غیر ملکوں پر برطانوی حکمرانی سے ان کے نزدیک یہ مراد تھی کہ وہاں کے غریب باشندوں کی حفاظت کی جائے اور تہذیب کو فروغ دیا جائے۔ وہ چاہتی تھیں کہ بے شمار اسپتال بنیں اور حق داروں کا ان کا حق ملے۔

جب ۱۸۷۱ء میں افریقیوں نے بشپ پیٹرسن کو قتل کیا تو ملکہ نے اپنے روزنامچے میں لکھا کہ بے چارے مقامی باشندے اتنی کثرت سے قتل اور اغوا کئے جاتے ہیں کہ وہ ہر سفید فام کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

جب یہ افواہ اڑتی اڑتی ملکہ تک پہنچی کہ لارڈ کچنر نے مہدی سوڈانی کی کھوپڑی اپنی میز پر رکھ کر اس کی بے حرمتی کی ہے (اس زمانے میں ہر چیز کو قلم دان یا شمع دان بنا لینا عام بات تھی) تو ملکہ نے انہیں لکھا کہ کاسۂ سر کو فوراً پورے احترام سے دفن کیا جائے۔

ایک بار موسم گرما میں ملکہ اسکاٹ لینڈ گئی ہوئی تھیں۔ بڑھاپا اپنے عروج پر تھا، ہاضمہ جواب دے رہا تھا اور دو قدم چل کر تھک جاتی تھیں۔ وہیں خبر ملی کہ جنوب میں ریل گاڑی کا بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ زخمیوں کی مزاج پرسی کے لئے فوراً ہی چل پڑیں۔ اُن میں 'دو بے چارے ہندوستانی جنٹل مین' بھی تھے۔

انگلستان میں ایک عقیدہ عام ہو چلا تھا کہ ملکہ کی شخصیت میں کچھ پراسرار مسیحائی چھپی ہے۔ بوڑھی خواتین کو یقین تھا کہ ملکہ ان کو ہاتھ بھی لگا دیں تو ان کی ساری تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ صحت افزا مقامات پر جانے والے مریضوں کو اگر وہ کہیں دیکھنے آ جاتیں تو بیماروں کی حالت بہتر ہونے لگتی۔ والدین اپنے بچوں کو لے کر آتے کہ وہ ایک نظر ملکہ کو دیکھ لیں تو صحت مند رہیں گے۔ امریکہ سے ایک ۷۶ سالہ سیاہ فام خاتون تمام عمر کی جمع پونجی خرچ کر کے ملکہ سے صرف ایک بار ملنے کے لئے انگلستان پہنچیں۔

جب ملکہ کی نواسی شہزادی مارگریٹ کی منگنی ہوئی اور وہ اپنی سسرال جانے کی تیاری کرنے لگی تو ملکہ بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے مارگریٹ سے کہا کہ تم اپنی بیوہ ماں کو چھوڑ کر جا رہی ہو، یہ اچھی بات نہیں۔ اس پر نواسی نے ملکہ سے کہا۔ ''میں مسلمانوں کے رویے سے متفق ہوں کہ والدین سب سے مقدم ہیں، لیکن یورپ میں تو مذہب کی تعلیم دیتے ہوئے یہ بات نہیں سکھائی جاتی۔''

منشی پانچ برس سے ملکہ کے پہلو سے لگے یوں ہی تو نہیں کھڑے تھے۔

اور شہزادی نے یہ بات یوں ہی تو نہیں کہہ دی ہوگی۔ کیا شاہی خاندان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ ملکہ کا رویّہ مسلمانوں کے رویّے سے شانہ ملانے لگا ہے؟

فساد کی ایک بڑی جڑ یہی بات تھی۔ منشی اور رفیع الدین احمد کے مخالفوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ہندوستانی عوام کے مختلف فرقوں اور عقیدوں کے معاملے میں ملکہ جانب دار ہوتی جا رہی ہیں۔

دوسرے اعتراضات کا اندازہ ڈاکٹر ریڈ Reid کی ترتیب دی ہوئی ایک فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک روز بیٹھ کر منشی کے بارے میں وہ تمام باتیں لکھیں جو انہیں سخت ناگوار گزرتی تھیں۔ مثلاً فرانس سے واپسی پر منشی نے ملکہ سے شکایت کی کہ ریل گاڑی میں اُن کا ڈبا ان کی حیثیت کی مناسبت سے صحیح جگہ نہیں لگایا گیا۔ ایک اور موقع پر ملکہ نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ اہم موقعوں پر منشی کو اُن گاڑیوں میں بٹھایا جائے جن میں شاہی گھرانے کے سرکردہ افراد بیٹھتے ہیں۔ تیسری شکایت یہ تھی کہ منشی صرف ایک رات کے لئے روم گئے جس پر ۲۲ پاؤنڈ اٹھے۔ ایک مرتبہ منشی نے اعلان کیا کہ ریل کے جس ڈبے میں وہ بیٹھے ہیں اس میں کسی دوسرے ہندوستانی کو بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چوتھا الزام یہ تھا کہ ملکہ معظمہ کی خادماؤں کے غسل خانے پر منشی نے قبضہ کر لیا ہے اور ان کا اصرار ہے کہ یہ غسل خانہ صرف ان کے تصرف میں رہے گا۔ پانچویں شکایت یہ تھی کہ ملکہ کی خادمائیں کہتی ہیں کہ منشی کی بیوی اور ساس انگلستان کے نہایت درجہ گرے پڑے مزدوروں سے بھی گھٹیا ہیں کیونکہ یہ قالینوں پر تھوکتی پھرتی ہیں اور نشست گاہ میں حوائج ضروری سے فارغ ہو لیتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ساتویں شکایت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں اور وہ یہ کہ منشی نے اٹلی میں ایک دکان کی بڑی کھڑکی میں بڑا سا فریم لگوایا جس میں ملکہ کی نو تصویریں دائرے کی شکل میں لگی تھیں اور ان سب کے بیچ خود منشی نے اپنی تصویر لگائی تھی۔ آخر دربار کے ایک اہل کار نے حکام سے کہہ کر وہاں سے منشی کی تصویر اتروائی۔ شکایت میں مزید لکھا تھا: اٹلی والے اُسے ہند کا ایسا شہزادہ کہتے ہیں کہ ملکہ جس کی محبت میں گرفتار ہیں اور اسی باعث ان کا فوٹو عین وسط میں لگا۔ ڈاکٹر ریڈ کو آخری شکایت یہ تھی کہ منشی نے ملکہ سے گلہ کیا کہ اخبار انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس پر ملکہ نے متعلقہ افراد کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ اس بات کا اہتمام کریں کہ اخبارات منشی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اپنے کالموں میں ان کا ذکر کثرت سے کیا کریں۔

ڈاکٹر ریڈ نے جرمنی کا ایک واقعہ لکھا ہے جہاں ملکہ کے خاندان کے دو بچوں کی شادی تھی اور جس میں شرکت کے لئے وکٹوریا اپنے تام جھام کے ساتھ پہنچیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ان کے منشی بھی تھے۔ وہاں دولہا کے باپ نے، جو ملکہ کے بیٹے بھی تھے، ماں کے نام یہ پیغام بھجوایا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، یہ شخص کہ نام جس کا منشی ہے، شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے گرجا گھر میں اہل دربار کے ساتھ نہیں آئے گا اور اسے ملازموں کے ساتھ بٹھایا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ملکہ نے ہر طرف اپنے ہرکارے دوڑا دیئے اور بالآخر یہ طے پایا کہ منشی کو گرجے کی جس گیلری میں بٹھایا جائے گا اس میں کوئی نوکر نہیں بیٹھے گا۔ ڈاکٹر ریڈ لکھتے ہیں کہ منشی کو بڑے اہتمام سے لے جا کر ان

کی نشست پر بٹھایا گیا لیکن انہوں نے بیٹھتے ہی بھانپ لیا کہ ان کے آس پاس ملکہ کے سائیس اور گھوڑوں کے مالشئے بیٹھے ہیں۔ منشی اتنے مشتعل ہوئے کہ تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر چلے گئے اور تقریب بھی نہیں دیکھی۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر انہوں نے طیش کے عالم میں ملکہ کے نام ایک خط لکھا جو دلہن کی رخصت کے بعد ان کے حوالے کیا گیا۔ اسے پڑھ کر ملکہ وکٹوریا سخت پریشان ہوئیں اور دیر تک روتی رہیں۔ اس پر ملازموں میں خوب چہ می گوئیاں ہوئیں۔ ملکہ نے منشی کی نگرانی کا کام اپنے سکریٹری سر ہنری کے ہاتھ سے لے کر اپنے بیٹے کے پرائیوٹ سکریٹری کو سونپ دیا اور اسے تمام باتیں اچھی طرح سمجھا دیں۔ اس کے بعد منشی ہر روز شاہی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر جاتے تھے جس کے پیچھے ایک فٹ مین کھڑا ہوتا تھا اور ایک شاہی افسران کے بائیں ہاتھ پر بیٹھتا تھا۔ انہیں سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا جہاں یہ افسران کی پیشوائی کے لئے موجود ہوتا تھا مگر، ڈاکٹر ریڈ کے بقول، ہر شخص ان سے کتراتا تھا۔

اس واقعے سے ایک بات واضح ہے۔ ملکہ نے طے کر لیا تھا کہ اہل دربار جو چاہیں کہیں اور اہل خاندان جو چاہیں سوچیں، وہ اپنے منشی کے گرد تعمیر کیا ہوا اپنے حصار گرنے نہیں دیں گی۔

پھر اس کہانی کا سب سے بڑا زلزلہ سر اٹھانے لگا اور یہاں سے وہاں تک تہلکہ مچ گیا۔

ڈاکٹر ریڈ کو ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر نے بتایا کہ منشی حافظ عبدالکریم اپنی زندگی کے حالات لکھ رہے ہیں اور دو جلدوں میں اپنی یہ سوانح اگلے سال کے شروع میں شائع کرانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔

یہ خبر بم کا گولا بن کر گری۔ شاہی عملے کے جو افراد ملکہ سے قریب تھے انہوں نے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ سوانح کس کے مشورے اور کس کے اشتراک اور تعاون سے لکھی جارہی تھی۔ منشی کی انگریزی تو ایسی نہ تھی کہ وہ پوری پوری کتابیں لکھ سکیں۔ بہت ممکن ہے کسی نے املا بولا ہو اور منشی لکھتے گئے ہوں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ اس کی اشاعت کو رکوانے کے لئے ملکہ کو راضی کرنے کی ضرورت پڑی۔ کیا ہوا، کیسے ہوا کہ خود منشی بھی دو جلدوں پر مشتمل اپنی داستانِ حیات شائع نہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اگر یہ بات طے تھی کہ یہ خود نوشت سوانح دو جلدوں میں شائع ہو گی تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسودہ لکھا جا چکا تھا اور وہ اتنا ضخیم ہو چلا تھا کہ اسے دو حصوں میں چھاپنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

یقیناً اس مسودے کا بھی وہی حشر ہوا جو بے شمار دوسرے کاغذات کا ہوا۔ اس کے احوال آگے۔

یہ مارچ ۱۸۹۵ کی بات ہے۔ ملکہ فرانس کے شہر نیس گئی ہوئی تھیں۔ ایک مقامی اخبار میں ان کے آنے کی خبر چھپی۔ اس میں کہیں یہ لکھا گیا کہ ملکہ گھوڑا گاڑی سے اتریں تو منشی نے انہیں سہارا دے کر اتارا۔ یہ فرض عموماً ملازم انجام دیا کرتے ہیں۔

اگلے روز اخبار کو معذرت نامہ چھاپنا پڑا جس میں لکھا تھا کہ یہ بات غلطی سے لکھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ملکہ کو ہمیشہ ان کے ہندوستانی ملازم سہارا دے کر گاڑی سے اتارتے ہیں اس لئے مغالطہ ہوا۔ منشی تو عالم فاضل انسان ہیں اور ملکہ کے انڈین سکریٹری اور ہندوستانی زبان کے استاد ہیں اور ان کے ہمراہیوں میں بہت اہمیت کے حامل ہیں اور کئی افراد ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور اکثر انہیں اپنی شاہی مالکہ اور شاگردہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

صاف نظر آتا تھا کہ اس پردے میں منشی حافظ عبدالکریم آگرے والے اور رفیع الدین احمد پونا والے بول رہے ہیں۔

ان ہی دنوں حافظ صاحب کے سینے پر سی آئی ای کا تمغہ آراستہ کیا گیا۔

سال کے آخر میں ملکہ کے ذاتی سیکریٹری سرہنری پونسونبی Ponsonby انتقال کر گئے۔ ملکہ نے ان کی بیٹی کو لکھا کہ بس ایک ہی شخص ہے جسے تمہارے باپ کے مرنے کا سب سے زیادہ رنج ہے وہ ہے میرا پیارا منشی عبدالکریم۔ تمہارے والد سب سے زیادہ اس پر مہربان تھے اور ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ منشی کا کہنا ہے کہ اسے یوں لگتا ہے گویا اس کے دوسرے والد چل بسے ہیں۔ اسے بہت افسوس ہے کہ کل تمہارے والد کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے گا البتہ وہ ایک گلدستہ بھیجے گا۔ اس پر لگے ہوئے پرچے پر منشی نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کی نقل تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں تاکہ تم اطمینان سے پڑھ سکو ورنہ بعد میں ایسے ہی بہت سے گلدستوں میں اسے الگ سے پڑھنا مشکل ہوگا۔

سرہنری کی بیٹی نے یہ خط ڈاکٹر ریڈ کو بھیجا اور پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے، میں منشی کو خط لکھوں؟ یوں میں اسے بھائی بنانے کے لئے تیار نہیں۔

ریڈ نے فوراً جواب دیا کہ منشی کے نام کچھ نہ لکھنا۔ اور یہ کہ وہ گلدستہ شاہی باغ میں ملکہ کے خصوصی حکم پر بنا ہے اور اس پر لگے ہوئے پرچے کا مضمون خود ملکہ نے املا بول کر لکھوایا ہے۔

منشی کے بارے میں بہت سے باتیں ڈاکٹر ریڈ نے اپنی ایک سبز کتاب میں لکھی تھیں لیکن ان کے مرنے کے بعد یہ کتاب ان کی وصیت کے مطابق جلا دی گئی۔ اس میں منشی کے پوشیدہ مرض میں مبتلا ہونے کی تفصیل بھی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ سن ۹۶ کے آخر سے وہ ان کے جریان gleet کا علاج کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے ملکہ کو بھی بتایا کہ منشی پر اس مرض کا دوبارہ حملہ ہوا ہے۔

شاید ڈاکٹر ریڈ کا خیال ہوگا کہ ملکہ اپنے منشی سے بیزار ہو جائیں گی۔ لیکن اس کے برعکس یہ ہوا کہ انہوں نے منشی کو اپنے ساتھ فرانس لے جانے کا اعلان کر دیا۔ اس پر ان کا عملہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور اس کا کچھ احوال گزشتہ صفحوں میں آچکا ہے۔ جب بات بڑھی تو ولی عہد شہزادے نے ریڈ کو بلایا اور اس سارے بحران کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر ریڈ تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس روز سارے ہی جلے پھپھولے پھوڑے۔ شہزادے کو یہ بھی بتایا گیا کہ سارا عملہ باغی ہو گیا ہے۔ انہوں نے پوری بات سنی اور یقین دلایا کہ عملہ جو بھی فیصلہ کرے گا، وہ اس کی حمایت کریں گے۔

محل کے عملے میں اس وقت کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ سب لوگ مل کر ہڑتال کریں گے یا استعفے دے دیں گے۔ ملکہ ہمیشہ کی جری تھیں۔ وہ اس قسم کا تاثر دینے کے لئے تیار نہیں تھیں کہ محل کا عملہ ان پر حکم چلاتا ہے اور وہ کسی سے دب کر رہتی ہیں۔

پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ تمام مخالفت کے باوجود منشی فرانس پہنچ گئے اور یہی نہیں، ساتھ رفیع الدین احمد کو بھی لیتے آئے۔ اس پر عملے میں سرکشی کی لہر دوڑ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ جیسے بھی بنا، منشی نے رفیع الدین کو چلتا کیا۔ خیال تھا کہ اب طوفان تھم جائے گا لیکن اب کے شورش شدید تھی۔ ملکہ نے محل کے عملے کے نام پیغام بھجوایا کہ منشی کو ان لوگوں سے وابستہ تصور کیا جائے جو جنٹل مین کہلاتے ہیں۔ طے پایا کہ بس، بہت ہوا۔ اب اگر ہر مجسٹی نے اس قسم کی بے جا باتوں پر اصرار کیا تو پورا عملہ مل کر استعفا دے دے گا۔

اس کے بعد بہت بھاری پیمانے پر صلاح مشورے شروع ہوئے۔ دیر تک غور ہوتا رہا۔ ملکہ نے ایک افسر اعلیٰ کے سپرد یہ کام کیا کہ پتہ کرے کہ ان لوگوں کو منشی کے بارے میں کیا اعتراض ہیں۔ خود ڈاکٹر ریڈ نے ملکہ کے ساتھ طویل ملاقاتیں کیں اور شکایات کا پورا دفتر کھول دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ملکہ نے اظہار تاسف بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ واقعی منشی کی جا و بیجا فرمائشیں پوری کرتی رہیں لیکن وہ ڈٹ کر منشی کی وکالت بھی کرتی رہیں۔

اس پر دو دن تک گفتگو کا سلسلہ چلا۔ اسی دوران ملکہ کو لندن کی پولیس کے سربراہ کا وہ خط دکھایا گیا جس میں خبردار کیا گیا تھا کہ حافظ عبدالکریم مسلم پٹریاٹک لیگ کے معاملات میں ملوث ہیں۔ یہ بیان ڈاکٹر ریڈ کا ہے جو کہتے ہیں کہ ایک بار تو ملکہ رونے لگیں اور بولیں کہ مجھ سے بھول ہوئی ہے اور مجھے پتہ ہے کہ لوگ ان کے بارے میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور یہ کہ وہ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک کر دیں گی کیونکہ اگر فوراً ہی کوئی قدم اٹھایا گیا تو اسکینڈل بنے گا۔

اہل دربار نے کہا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔

یور مجسٹی، آپ کا دماغ خراب ہے

اپریل کی چوتھی تاریخ تھی اور حضرت عیسیٰ کو پیدا ہوئے ۱۸۹۷ برس گزر چکے تھے۔

ڈاکٹر ریڈ قیصر ہند، ملکہ برطانیہ کے حضور پیش ہوئے اور کچھ صاف اور کچھ ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا: مجھے یوں لگتا ہے کہ ہر مجسٹی کے ذہن پر صرف منشی سوار ہے۔ میں عرض کردوں کے اعلیٰ مناصب پر فائز لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ جو واحد بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یور مجسٹی کا دماغ ٹھیک نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وقت آنے پر میں شاہی معالج کی حیثیت سے اس بات کا اعلان کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں بھی ہوں۔ کل میں پرنس آف ویلز سے بھی ملا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر وہ کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ساری صورت حال خود ان کی ذات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ یہ صورت حال برطانیہ کے تخت کو بھی متاثر کرتی ہے۔

ملکہ عالیہ سے نمٹ کر اب ڈاکٹر ریڈ منشی عبدالکریم کی طرف رجوع ہوئے اور اس بار نہ کوئی تکلف روا رکھا اور نہ کوئی بات ڈھکی چھپی رکھی۔ اہلِ انگلستان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جب کوئی بات تحریر کرتے ہیں تو دو ایک باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسی کسی بات کا خیال رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ منشی کے نام ان کے خط کا خلاصہ:

"اپنی خوش گمانیوں اور ہٹ دھرمی سے تم نے اپنے لئے کچھ ایسی صورت حال پیدا کرلی ہے جسے مزید جاری رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تم نے ملکہ سے جتنے جھوٹ بولے، انہوں نے سب کے سب مان لئے اور اپنی خوش خلقی کی وجہ سے تمہیں اب تک وہ سب کچھ دیا جو تم نے طلب کیا۔ لیکن اب انہیں وہ تمام باتیں معلوم ہونے لگی ہیں جو انگلستان اور ہندوستان میں ہر ایک جانتا ہے اور وہ یہ کہ تم بہروپئے ہو۔ تمہاری اصل کیا ہے، ہمیں ہندوستان سے تمہارے باپ، بیوی اور خود تمہارے بارے

میں پورا کچا چٹھا مل گیا ہے۔ تمہارا تعلق بہت گھٹیا طبقے سے ہے اور تم کبھی بھی جنٹل مین نہیں ہوسکتے۔ تمہاری تعلیم صفر ہے۔ تمہیں 'سکریٹری' کہنا مضحکہ خیز ہے۔ تم ایک ایسا انگریزی یا ہندوستانی خط نہیں لکھ سکتے جو سکریٹری کے نام پر دھبّا نہ لگائے۔ تمہارے دو چہرے ہیں، ایک وہ جو تم ملکہ کو دکھاتے ہو اور دوسرا وہ چہرا جو ان کے کمرے سے باہر نظر آتا ہے۔ ملکہ کہتی ہیں کہ انہوں نے دیکھا ہے، تم ہر ایک کے ساتھ شفیق،دیانت دار اور کرم فرما ہو۔ مگر حقیقت کیا ہے؟ ملکہ کہتی ہیں کہ دوسرے ہندوستانی تمہیں پسند کرتے ہیں اور تمہاری عزت کرتے ہیں۔لیکن کیا تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے بارے میں مجھ سے کیا کہتے ہیں؟ اور اگر انہیں تمہارا خوف نہ ہو تو وہ کیا کہیں گے۔ تم ملکہ کو دوسرے طریقوں سے بھی دھوکا دیتے رہے ہو۔تم نے ملکہ سے کہا کہ ہندوستان میں پیسہ لے کر رسید نہیں دی جاتی لہٰذا تم ملکہ کے خزانچی کو رسید دینے کے پابند نہیں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے اور اس کا مطلب ہے کہ تم ملکہ کو فریب دینا چاہتے ہو۔ پولیس کو اس بات کا اور دوسری باتوں کا علم ہے۔ملکہ کے جو خط تمہارے پاس ہیں وہ انہوں نے مانگے تھے۔ وہ سب کہاں ہیں؟ وہ خط تم نے ملکہ کو فوراً ہی کیوں نہیں دئیے؟ بہتر ہے کہ اب تم یہ خط ملکہ کے حوالے کرو، ورنہ تمہارے لئے بہت برا ہوگا۔اگر ملکہ مرگئیں اور ان کا کوئی خط تمہارے قبضے سے نکلا، تم پر ترس نہیں کھایا جائے گا۔

میں نے جو باتیں تمہیں لکھی ہیں،ملکہ کو ان تمام باتوں کا علم نہیں کیونکہ انہیں یہ جان کر صدمہ پہنچے گا کہ تم نے انہیں کیسا جُل دیا ہے اور تم کتنے بدمعاش ہواور وہ ہیں کہ آج تک آس لگائے بیٹھی ہیں کہ تم ان کے پاس رہو گے۔لیکن اگر ملکہ کو بتادیا گیا کہ تم نے انہیں کیسے کیسے دھوکے دئیے ہیں تو تمہارے لئے انگلستان میں رہنا مشکل ہوجائے گا۔

ملکہ کہتی ہیں کہ تم انہیں بتاتے ہو کہ تم بے حد پریشان ہو اور نہ تم سے سویا جاتا ہے نہ کچھ کھایا جاتا ہے۔ملکہ ہیں کہ اپنی شفقت کے مارے تمہاری یہ باتیں سن سن کر فکر مند ہیں۔لیکن اگر تم نے دوبارہ ایسا کیا اور ملکہ کو ستایا تو انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا جائے گا۔پھر ان کا رحم ان کے غضب میں بدل جائے گا اور تمہاری بربادی اور زیادہ تیزی سے تم پر آئے گی"۔

اس خط سے اور کچھ ثابت ہو یا نہ ہو، یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر ریڈ کے پاس کچھ زیادہ کرنے دھرنے کو نہیں تھا۔

فرانس روانگی سے پہلے ملکہ نے ہر جنٹل مین کے نام ایک یادداشت لکھی اور انہیں بتایا کہ وہ منشی کے ساتھ کیسے پیش آئیں۔ انہوں نے خواہش ظاہر کہ اب اس تکلیف دہ موضوع پر کہیں بھی بات نہ کریں اور منشی کے خلاف محل کے ملازموں کے ہم خیال نہ بنیں۔ گویا ملکہ اپنے جنٹل مین اور اپنے ملازموں کے احساسات جان گئی تھیں لیکن منشی کی پاسبانی اسی شدومد سے کئے جارہی تھیں۔ اور شاید آگرے کے شہزادے کی ناز برداری میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں آرہی تھی۔

ڈاکٹر ریڈ ہی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ منشی جب ہندوستان گئے ہوئے تھے تو وہاں سے ملکہ کو لکھا کہ مجھے نواب کا خطاب دے دیجئے۔ ملکہ نے غالباً میجر جنرل ڈینھی سے ان کے ہندوستان کے طویل تجربے کی بنا پر پوچھا کہ یہ نواب کیا ہوتا ہے اور جب انہوں نے بتایا کہ یہ شاہانہ شخصیات کے لئے مخصوص ہوتا ہے تو ملکہ نے کہا کہ پھر تو یہ مشکل ہے۔

منشی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ملکہ کے پیچھے پڑے تھے کہ انہیں جوبلی کی خوشی میں ایم وی او یعنی ممبر آف دی رائل وکٹورین آرڈر دیا جائے۔ ملکہ شاید آمادہ بھی تھیں لیکن ڈاکٹر ریڈ اڑ گئے اور ملکہ سے ان کی گرما گرمی بھی ہوئی۔

اسی دوران شاہی اخراجات کے نگراں سر فلیٹ ووڈ ایڈورڈ نے ملکہ کے نام خط لکھا کہ اگر آپ نے منشی کو یہ اعزاز دیا تو نتائج نہایت افسوسناک ہوں گے۔

اس پر تو ملکہ چراغ پا ہو گئیں اور اشتعال کے عالم میں ڈاکٹر ریڈ کو لکھا کہ سر فلیٹ ووڈ نے کچھ اس انداز میں مجھے دھمکی دی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ جو نہ کرنا چاہوں وہ کر گزروں۔ اس سے غریب منشی کو جو تکلیف ہو گی میں اسے ذہن سے مٹا نہیں سکتی۔ جس شخص پر کوئی وجہ نہیں کہ میں اعتماد نہ کروں اس کے ساتھ ایسی نفرت کا مظاہرہ ایک شرمناک غیر منصفانہ مداخلت کے سوا کچھ نہیں۔

وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے اپنے دھیمے لب و لہجے میں ملکہ کو سمجھایا کہ اس مرحلے پر منشی کو بڑھاوا دینا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اس سے ہندوؤں میں حسد پیدا ہوگا اور یوں لگے گا جیسے ملکہ اپنی مسلمان رعایا کو نوازتی ہیں۔ اس کے جواب میں ملکہ نے لکھا کہ میں اگر منشی کو یہ اعزاز نہیں دے رہی ہوں تو سر فلیٹ ووڈ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے کہنے پر ایسا کر رہی ہوں بلکہ یہ لارڈ سالسبری کے مشورے کا نتیجہ ہے۔

ان ہی دنوں قصرِ ونڈسر کے مشرقی لان پر ملکہ نے اپنے فوجی دستوں کا معائنہ کیا۔ ان میں ہندوستان کا گھوڑ سوار دستہ بھی تھا جس نے جوبلی کی تقریبات میں گارڈ آف آنر پیش کیا تھا اور جس کی شان وشکوہ کے ہر طرف چرچے تھے۔ معائنے کی اس شاندار تقریب میں ہندوستانی شہزادے اور راجا مہاراجا بھی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ آئے تھے۔ ملکہ اس شام بہت مسرور تھیں کہ ان کی پوری فرماں روائی میں ہندوستان انہیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اگلے روز اس تقریب کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ اس کے احوال کا جو کورٹ سرکلر جاری ہوا اس میں ملکہ نے دیکھا کہ سارے ہی سرکردہ مہمانوں کا ذکر ہے لیکن منشی عبدالکریم کا کہیں نام تک نہیں۔ ملکہ محل کے داروغہ پر برس پڑیں اور ایک بار پھر ڈاکٹر ریڈ کو بیچ بچاؤ کرنا پڑا۔

جو ہندوستانی ملازم عبدالکریم سے ناخوش تھے انہوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ریڈ سے بڑھ کر ان کا کوئی ہمدرد نہیں۔ ڈاکٹر کو بھی منشی کے خلاف گواہوں کی ضرورت تھی چنانچہ احمد حسین ان کے کام کا آدمی نکلا کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا پھر رہا تھا کہ منشی نے ملکہ سے ایک لاکھ روپے لئے ہیں۔

ریڈ نے جھٹ اس سے منشی کا کچا چٹھا لکھوالیا جو اس نے اپنی لنگڑی لولی انگریزی میں لکھ دیا اور آج تک محفوظ ہے۔ احمد حسین نے لکھا:

"منشی کو ہوس ہے، وہ ہر روز ملکہ سے بہت سی چیزیں مانگتا ہے۔ ملکہ بھی اسے بہت کچھ دیتی ہیں، تحفے بھی اور پیسہ بھی۔ ہندوستانی راجا بہت ناراض ہیں کہ منشی کو سی آئی ای ملا جب کہ راجا مہاراجا اور بڑے بڑے ہندوستانی اس سے محروم ہیں حالانکہ منشی بہت چھوٹا آدمی ہے جیسے ملکہ کی گھوڑا گاڑی کے پیچھے کھڑا ہونے والا آدمی، بلکہ وہ آدمی بھی زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام انگریز مجھ سے ناراض ہیں لیکن میں سب سے لڑتا ہوں اور ملکہ ہمیشہ میری مدد کرتی ہیں۔ میں منشی سے کہتا ہوں کہ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم خاموش رہو۔ تمہاری ملازمت صرف دس برس کی ہے، تم ہندوستان میں معمولی آدمی تھے اور تمہارا باپ بہت معمولی ڈاکٹر ہے اور تمہارا بھائی اور بہنوئی بہت معمولی ملازم اور سپاہی ہیں۔ ملکہ تمہیں بہت پیسہ دیتی ہیں اتنا تو وہ انگریزوں کو اور جنٹل مین کو بھی نہیں دیتیں۔ پندرہ پندرہ بیس بیس سال پرانے انگریز ملازموں کو کچھ بھی نہیں ملتا کیونکہ یہ انگریزی رواج نہیں۔ لیکن ملکہ تمہیں بہت پیسہ دیتی ہیں اور تمہارے بھائی اور بہنوئی کی سفارشیں کرتی ہیں اور بڑا مکان اور زمین دلواتی ہیں۔ بہتر ہے تم خاموش رہو اور ہر وقت ہاتھ پھیلائے کھڑے نہ رہا کرو اور نہ بڑا افسر بننے کی کوشش کرو"۔

ایک جانب تو یہ کہا جا رہا تھا کہ دوسرے ہندوستانی ملازم منشی سے ڈرتے ہیں اور دوسری جانب احمد حسین نے اس قسم کی تحریر دینے کی جرات کر لی، ظاہر ہے کہ کوئی اس کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ منشی کے دشمنوں کا

ایک جلوس چلا جا رہا ہے جس کے علم بردار ڈاکٹر ریڈ ہیں۔ احمد حسین کے لگائے ہوئے الزامات اور دوسری شکایتیں لے کر وہ پھر ملکہ کے پاس پہنچے۔ ہر مرتبہ وہ اس یقین کے ساتھ جاتے تھے کہ اس بار ملکہ توبہ کر لیں گی اور ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی ملکہ کا صاف جواب آ گیا جس میں انہوں نے لکھا کہ منشی کے خلاف نئے بنئے الزام گھڑے جا رہے ہیں اور حاسدوں نے اس پر بددیانتی کے الزامات لگانے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ بات میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہے۔ میں اسے دس سال سے جانتی ہوں اور بہت قریب سے جانتی ہوں اور پورے یقین سے کہتی ہوں کہ اس پر شک یا شبہ کرنے کا ایک بھی سبب نہیں۔ اب اس پر الزام لگا ہے کہ اس نے ایک انگریز ملازم کی ترقی رکوائی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے گھائل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بے چارے منشی نے تو کبھی اس ملازم کا نام تک نہیں لیا بلکہ میں نے اسے مشکل میں گھرے ہوئے ہر شخص کی مدد کرنے ہی پر آمادہ پایا۔ منشی کے آنے سے پہلے بھی ملازموں کے بارے میں سارے فیصلے میں کرتی تھی۔ اب بھی سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ لوگ مجھ سے اپنی مرضی کے فیصلے کرائیں۔

ملکہ کا یہ خط پا کر ڈاکٹر ریڈ پھر ان کے پاس پہنچے اور نہ صرف تلخ کلامی کی بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر منشی کے قضیے سے آپ نہیں نمٹ سکتیں تو یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ملکہ نے وہی جواب دیا جو ان سے متوقع تھا۔ ٹکا سا جواب۔ اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر کے نام سولہ صفحوں کا خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مشرق والے کہانیاں بناتے ہیں اور بلا کے حاسد ہوتے ہیں۔ اوپر سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت ہے۔ یہ لوگ حکام سے بات کرتے ہیں اور حکام ان کی باتیں جھٹ مان جاتے ہیں۔ یہ بات میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر ریڈ کے کاغذات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس لعنت ملامت کے قصے میں پڑ کر انہوں نے اپنی صحت خراب کر لی۔ اب صورت یہ تھی کہ منشی کے دشمنوں کو پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ ملکہ تک ان کی بات صرف ڈاکٹر صاحب ہی پہنچا سکتے ہیں لہٰذا ہر ایک نے ان کے کان میں ہر طرح کی بات پھونکنی شروع کر دی۔

۸ ستمبر کو وہ دو مرتبہ ملکہ سے ملنے گئے۔ ان ملاقاتوں کے بعد ان کے پاس ملکہ کا پیغام آیا:

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھریں۔ یہ مسخ شدہ اور مبالغہ آمیز کہانیاں ہیں جنہیں سننا بھی غلط ہے۔ آپ ان لوگوں کو من گھڑت قصے سنانے کی اجازت ہی نہ دیجئے۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔"

ڈاکٹر ریڈ کو بھی ملکہ کے رویے سے نفرت ہو چلی تھی۔ انہوں نے اگلے ہی روز ان سے کہا کہ ہر شخص کہہ رہا ہے کہ محل میں جو کچھ ہو رہا ہے سب منشی کے زیر اثر ہے اور یہ بات منشی خود بھی جانتا ہے۔

جس بات کی ملکہ کو داد دینی پڑے گی وہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ڈاکٹر ریڈ کو جھوٹا نہیں کہا اور کبھی ان کی توقیر میں کمی نہیں آنے دی۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر ریڈ نے اس موقع پر ملکۂ برطانیہ کو فاتر العقل جانا۔

اس دوران منشی عبدالکریم کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا اور انہوں نے یہ کہہ کر ڈاکٹر ریڈ کی آرزو پوری کر دی کہ ان کا برطانیہ میں رہنا مناسب نہیں اور وہ سال کے خاتمے تک آگرہ واپس چلے جانا چاہتے ہیں۔

بجائے اس کہ اہل دربار یہ بات سن کر جشن مناتے، انہوں نے کہا کہ یہ بھی منشی کی بدذاتی ہے اور اس طرح کی باتیں کر کے وہ ملکہ کے جذبات سے کھیل رہا ہے تاکہ محل میں اور ہنگامہ برپا ہو۔

۱۰ ستمبر کو ڈاکٹر ریڈ کے نام ملکہ کا پیغام آیا کہ میں منشی کی باتوں سے سخت پریشان ہوں۔ وہ سال کے خاتمے تک چلا جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر بات کی تفتیش کرالی جائے اور وہ تمام رسیدیں پیش کرنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ اس قسم کا رویہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے اس کے احساسات کا بخوبی اندازہ ہے اور میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں اسے یوں جانے نہیں دوں گی۔ اس کے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا اس نے سارے الزامات مان لئے ہیں اور میں ہر قسم کے شرمناک دباؤ کے آگے جھک گئی ہوں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جب ملکہ وکٹوریا اپنی جرمن نسل کی کھلائی لیزن کی خاطر محاذ پر ڈٹ گئی تھیں تو پیار سے کہا جاتا تھا کہ کیوں نہ ہو، آخر کو وہ سپاہی کی بیٹی ہیں۔ ہار ماننا انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ اور اب ایک ہندوستانی باشندے کا سوال اٹھا تو ملکہ پر دیوانگی کے الزام لگنے لگے۔ اسکاٹ لینڈ کے اکھڑ دیہاتی جان براؤن کا قضیہ تھا تو پورا ملک انہیں پیار سے مسز براؤن کہنے لگا تھا اور کہتا تھا کہ ملکہ کے بڑھے ہوئے پیٹ میں ایک چھوٹا سا جان براؤن پل رہا ہے۔ لیکن اب اس تیسرے ملازم کا قصہ اٹھا تو ہرچند کہ عام لوگوں کے جذبات کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آتا البتہ سارا لاوا محل کے اندر ہی پکتا رہا اور شاہی خاندان سے لے کر معمولی ملازموں تک ہر ایک تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا اور ولی عہد شہزادے پرنس آف ویلز سے لے کر ہندوستانی بیرے خانسامے تک ہر شخص نے ڈاکٹر ریڈ کو اپنا وکیل کر لیا۔ ڈاکٹر ریڈ نے بھی اسے اپنی انا کا معاملہ بنا لیا اور کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قصے میں پڑ کر ڈاکٹر نے اپنی صحت خراب کر لی۔

ستمبر کے وسط میں وہ بحالی صحت کے لئے رخصت پر اپنی ماں کے گھر چلے گئے اور دعا مانگنے لگے کہ ان کے واپس آنے تک محل کو منشی سے نجات مل جائے۔ مگر ان کے جانے کے چند دن بعد ہی ان کے نام ملکہ کا خط آیا جس میں یہی لکھا تھا کہ منشی کے بارے میں وہ فکرمند ہیں اور تشویش میں مبتلا ہیں۔

۱۶ ستمبر کو ایک نیا طوفان اٹھا۔ اخبار ڈیلی گرافک میں ملکہ کی ایک بڑی سی تصویر چھپی۔ جس میں وہ اپنی میز کرسی پر بیٹھی ہیں، ان کا کتا ان کے قدموں میں بیٹھا ہے اور ملکہ کاغذات پر دستخط کر رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ ہے۔ سامنے منشی عبدالکریم کچھ کاغذ پکڑے کھڑے ہیں۔ ان کا وہ نوجوانی کا بانکپن جا چکا ہے۔ مٹاپا ان پر اور ان کے چہرے پر چھایا ہوا ہے۔ جس پر صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ ملکہ کے منظورِ نظر ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن تصویر کے نیچے لکھا تھا:

''ہائی لینڈز میں ملکہ کے روز و شب۔ ہر مجسٹی منشی حافظ عبدالکریم سی آئی اے سے ہندوستانی زبان کا سبق لے رہی ہیں۔''

ڈاکٹر ریڈ سیدھے ملکہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ فوٹو کے نیچے لکھی ہوئی عبارت توہین آمیز ہے۔ اس پر ملکہ کچھ بے چین ہوئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ریڈ سائیکل پر بیٹھے اور سیدھے فوٹو گرافر کے پاس پہنچے جس نے کہا کہ منشی نے اسے اس طرح کی تصویر اتارنے کا حکم دیا تھا اور ان ہی کی ہدایت پر یہ تصویر اخبار میں چھپی ہے۔

ڈاکٹر ریڈ نے جا کر ملکہ کو ساری بات بتا دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد ملکہ کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔ لیکن ہوا یہ کہ ملکہ نے (صاف ظاہر ہے کہ منشی سے مشورے کے بعد) ڈاکٹر ریڈ کو لکھا کہ تم فوٹو گرافر کے پاس کیوں گئے اور اس سے پوچھ گچھ کیوں کی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے جانے سے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اب منشی تمہیں اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگا ہے اور یہ بات میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔

اسی سہ پہر ۱۴ صفحوں کا ایک خط ڈاکٹر ریڈ کے پاس پہنچا جس میں ملکہ نے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا اور ڈاکٹر ریڈ کو یہ بھی لکھا کہ تم بھی مخالفوں سے جا ملے۔ میں تمہاری اس احمقانہ حرکت پر بے حد ناراض اور پریشان ہوں۔ بدقسمتی سے اس کا الزام مجھی پر جاتا ہے۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ اس تصویر کی اشاعت کی اجازت نہ دیتی اور اس تکلیف دہ صورتِ حال سے بچ جاتی۔ تم ہی بتاؤ کہ جس شخص پر میں دس برس تک اعتماد کرتی رہی ہوں اب اس سے کیسے کہہ دوں کہ مجھے تم پر نہیں، دوسروں پر اعتماد ہے۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میرے جنٹل مین ایک ایسے شخص پر جاسوسی کراتے رہتے ہیں جس پر شبہ کرنے کا میرے پاس نہ کوئی جواز ہے اور نہ کوئی ثبوت۔ اگر میرے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوششیں جاری رکھی گئیں تو میں تم سے بھی اس موضوع پر بات کرنی چھوڑ دوں گی۔ میں آج شام منشی سے ملنے والی ہوں اور ڈرتی ہوں کہ وہ پھر خفا ہوگا۔ وہ تم لوگوں کے خلاف اتنا مشتعل ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم لوگ ان دنوں اس سے گفتگو کرو۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ تم دوسروں کے مقابلے میں میری ڈھال بن کر کھڑے ہو لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم بھی دوسروں کے سُر میں سُر ملا کر گا رہے ہو۔ بہتر

ہے کہ اب اس قصے کو یہیں ختم کرو اور اس کا ایک نیا اسکینڈل بنانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھ سے یہ بھول بھی ہوئی کہ اُس رات میں نے منشی کو ساری بات بتادی، مجھے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ آخر میں میرا مشورہ ہے کہ میرے اس خط کو جلا دو۔

ملکہ اب اس محاذ پر تنہا تھیں اور بس ایک ہی شخص ان کے ساتھ تھا۔

رہ گئے ڈاکٹر ریڈ، تو وہ رات انہوں نے جاگ کر گزاری۔ سبب اس کا انہوں نے یہ لکھا کہ ملکہ نے مجھے منشی کے آگے ڈال دیا ہے۔ صبح پانچ بجے انہوں نے اپنا استعفا لکھا لیکن بھیجا نہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ملکہ کا رویہ بدل رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کی صحت بگڑنے لگی۔ ان کی ران پر پھوڑا نکل آیا اور ان کے گردن پر چھآ بلے پڑ گئے۔ اب جسم میں زہر پھیلنے کا خطرہ تھا۔ آخر وہ بستر سے لگ گئے اور ماں نے ان کی تیمارداری کی۔

کچھ روز بعد پھر ان کے نام ملکہ کا پیغام آیا جس میں لکھا تھا کہ تمہاری طبیعت کی خرابی کی خبر پر میں سخت پریشان ہوں، ظاہر کہ میں نے تمہیں پریشان کیا جس کا یہ نتیجہ نکلا۔ بس اب اس بارے میں سوچنا اور کسی سے بات کرنا بند کرو۔ میں بھی خاموش رہوں گی۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ ملکہ نے ڈاکٹر ریڈ پر بہت اعتماد کیا اور ان کی صاف گوئی کی بنا پر انہیں اپنا ہمراز بھی بنایا۔ ریڈ ۱۰ نومبر تک صحت یاب ہو کر واپس بالمورل پہنچ گئے۔ کرسمس سے تین دن پہلے انہوں نے ملکہ کو نئی خبر سنائی۔ منشی عبدالکریم ایک اور پوشیدہ مرض میں مبتلا ہیں۔ اس بار انہیں سوزاک gonorrhoea جیسا مرض لگا ہے اور وہ بہت شدید۔ پھر کرسمس کے دن انہوں نے ملکہ سے کوئی ۴۵ منٹ بات چیت کی جو خود ان کے بقول 'طوفانی' تھی۔ ملکہ غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھیں لیکن 'میں بھی اپنی جگہ اڑا رہا'۔

اگلے روز ملکہ کو پتہ چلا کہ ولی عہد شہزادے نے ڈاکٹر ریڈ کو اپنے پاس بلایا ہے۔ ملکہ نے جھٹ انہیں لکھا کہ خبردار جو تم وہاں گئے۔ وہاں پھر وہی شر انگیزی ہوگی، مداخلتیں ہوں گی اور طرح طرح کی کہانیاں بنیں گی۔ فوراً شہزادے کو معذرت کا خط لکھو۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے شہزادے کو لکھا کہ میری صحت اچھی نہیں رہتی اور ڈاکٹر ریڈ کی یہاں موجودگی بہت ضروری ہے اس لئے وہ نہیں آسکیں گے۔

منشی عبدالکریم کی کہانی کا یہ غور طلب مرحلہ ہے۔ اگر ڈاکٹر ریڈ کی تشخیص صحیح اور بیان درست ہے، جو ممکن ہے ہو، تو سوزاک جیسے مرض کے بارے میں طے ہے کہ یہ ہوا میں اُڑ کر نہیں لگتا۔ انسان یہ مرض کسی اور مریض، اور اکثر حالتوں میں کسی اور مریضہ سے لگا کر آتا ہے۔

تو کیا عبدالکریم یہ عارضہ آگرے سے لائے تھے؟ یا برطانیہ میں ان پر کچھ ایسی پڑی کہ یہ مرض لگ کر رہا؟ جہاں بھی لگا، کس سے لگا؟ کیا اس کی تشخیص کے بعد ملکہ سے ڈاکٹر ریڈ کا جو مباحثہ ہوا اس کا موضوع یہی بیماری تھی؟ کیا ڈاکٹر ریڈ کچھ اسی کی بات کرنے ولی عہد شہزادے کے پاس جانا چاہتے تھے جو ملکہ نے سختی سے انہیں جانے سے روکا؟ کیا اس قصے میں کوئی ایسا نام آتا تھا کہ ڈاکٹر ریڈ نے اپنی سبز ڈائری تلف کرادی؟ کیا پیارے عبدل کا روگ ان کی بیوی کو بھی لگا جو ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی؟ سوال ہیں کہ قطار باندھے کھڑے ہیں۔ منشی صاحب نے آگرے میں ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ ان کے اہل خانہ کہتے ہیں کہ حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوا لیکن یہ بھی سنا ہے کہ شہر میں کئی طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔

آیئے آگے چلیں۔

جنوری ۱۸۹۸ میں ڈاکٹر ریڈ چھٹی پر لندن گئے لیکن انہیں جلد ہی واپس آنا پڑا کیوں کہ محل میں ایک نہ ایک طوفان کھڑا تھا اور ہر طوفان کے مرکز میں منشی حافظ عبدالکریم تھے۔ اس بار ملکہ کے دوسرے ہندوستانی ملازم ہراساں تھے اور مصطفیٰ کام چھوڑ کر ہندوستان واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ بھی ملکہ سے بہت قریب تھا اور بہت خدمت گزار تھا لیکن اس بار وہ بھی تنگ آ گیا اور اس نے ڈاکٹر ریڈ کو لکھا کہ میں اپنی صحت یا اپنے کنبے کی وجہ سے نہیں بلکہ منشی کی بدسلوکی اور ظلم سے تنگ آ کر جانا چاہتا ہوں۔ ملکہ چاہتی ہیں کہ میں کچھ عرصے اور ٹھہر جاؤں لیکن اب میرا منشی کے ساتھ رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔

اس کے بعد مصطفیٰ نے اپنی مخصوص انگریزی میں لکھا:

He very bad man. If you send that debble (devil) away we stop.

۳ فروری کو ریڈ نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ملکہ حاضر دماغ نہیں رہی ہیں۔ میں نے ان کے حلق میں دوا لگائی لیکن وہ ایک منٹ بعد ہی بھول گئیں۔ مجھے پتہ چلا کہ وزیر اعظم کے کاغذات انہیں موصول ہوئے ہیں جس کے بعد سے وہ پریشان ہیں اور یہ کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ان کا منشی سے زبردست جھگڑا ہوا اور منشی ان پر خوب چیخے چلائے۔ بعد میں انہوں نے منشی کے نام ایک طویل خط لکھا۔

یہ جھگڑا رفیع الدین احمد کا تھا۔ منشی چاہتے تھے کہ اس سال بہار میں جب ملکہ فرانس جائیں تو رفیع الدین احمد کو ساتھ لے کر چلیں اور ملکہ انکار کر رہی تھیں۔ پچھلے سال اسی بات پر قیامت برپا ہو چکی تھی۔

۱۸ فروری کو خود وزیر اعظم ملکہ کے پاس آئے اور رفیع الدین کو ساتھ نہ لے جانے کا مشورہ دیا۔ ملکہ نے سبب پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ ان کا مسلم پیٹریاٹک لیگ سے تعلق ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ملکہ اس پر قائل

نہیں ہوئیں تب وزیر اعظم نے نئی دلیل پیش کی کہ اگر فرانس کے اخباروں کے ہاتھ کوئی شوشہ لگا تو وہ تماشا بنا ڈالیں گے۔ یہ بات ملکہ کی سمجھ میں آ گئی۔

رفیع الدین احمد ساتھ نہیں لے جائے گئے۔ جب ڈاکٹر ریڈ نے لارڈ سالسبری کو بتایا کہ منشی نے ملکہ کا جینا حرام کر رکھا ہے تو وہ بولے کہ ملکہ جب چاہیں اس شخص کو نکال دیں لیکن شاید یہ شخص ان کے جذبات کو تحریک دلاتا ہے اور شاید یہی ایک چیز رہ گئی ہے جو ان کے جذبات میں کوئی ولولہ بھرتی ہے۔

بات بھی شاید یہی تھی۔ ملکہ کو اپنی شان بہت عزیز تھی اور دشمنوں کے کہنے پر منشی کو چلتا کرنا ان کی شان کے خلاف ہوتا۔ ڈاکٹر ریڈ کی سوانح نگار مکیلا ریڈ Michaela Reid نے، جو ان کی بہو بھی ہیں، لکھا کہ یہ بات سوچنا بھی مشکل ہے کہ ملکہ منشی پر جان چھڑکتی ہوں گی، لیکن کیا پتہ چھڑکتی ہی ہوں۔ اس ایک شخص کے نام پر جو فساد برپا تھا، ہو سکتا ہے دربار کی اکتا دینے والی سیاست سے انہیں یک گونہ نجات دلاتا ہو۔ رہی دربار کی سیاست، تو پچاس سال تک اس میں الجھے رہنے کے بعد ملکہ اس سے تنگ آ گئی ہوں گی۔

۱۲ مارچ کو ملکہ کا قافلہ جانب فرانس روانہ ہوا۔ اس بار منشی ساتھ نہیں تھے۔ اس پر اہل دربار جشن مناہی رہے تھے کہ ایک روز دیکھا کہ منشی فرانس چلے آ رہے ہیں۔ ملکہ نے ریڈ کے نام ایک یادداشت لکھی کہ دیکھنا، اس بار پچھلے سال جیسی بدمزگی نہ ہونے پائے اور اگر کسی قسم کا فضیحتہ کھڑا ہو تو دربار کا کوئی شخص اس پر کان نہ دھرے۔ میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ میرے درباری میرے لوگوں کے بارے میں باتیں بنائیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ ۱۸۹۸ کی یہ تعطیلات خیر سے گزر گئیں۔ وکٹوریا اب بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور مزاج سے وہ جوش و ولولہ رخصت ہو رہا تھا۔ منشی کے بارے میں بھی اب انہوں نے چپ ہی سادھ لی لیکن کبھی کبھی اہل دربار کو ڈپٹ بھی دیتی تھیں۔

واپس برطانیہ آ کر ریڈ نے اعلیٰ حکام سے مشورے شروع کئے کہ منشی عبدالکریم کے پاس ملکہ کے جو خطوط ہیں، ملکہ کے مرنے کے بعد ان کا کیا بنے گا۔ کیوں نہ یہ سارے کاغذات ضبط کر لئے جائیں۔ یہ بات خاص طور پر پولیس کے سربراہ سے کی گئی۔ انہوں نے سارا معاملہ ڈاکٹر ریڈ پر چھوڑ دیا کیونکہ وہ ملکہ اور منشی، دونوں سے بہت قریب تھے اور ملکہ کی صحت کی جیسی خبر انہیں تھی، اور کس کو ہو گی لہٰذا وہی فیصلہ کریں کہ منشی کے کاغذات کو ٹھکانے لگانے کی گھڑی کب آئے گی۔

وہ گھڑی کہ ٹلنا جس کے مقدر ہی میں نہیں، آن پہنچی۔ نئے بادشاہ، شاہ ایڈورڈ ہفتم کے حکم پر منشی کے تین میں سے ایک مکان، فروگمور کاٹیج پر الاؤ روشن کیا گیا اور اس میں منشی حافظ عبدالکریم کے کاغذات جھونکے گئے۔ اس

وقت خود منشی اور ان کے بھتیجے شعلوں کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس منظر کے چشم دید گواہ درکار تھے لہٰذا شاہ کی نمائندگی کے لئے ملکہ الیکزانڈرا موجود تھیں۔ آنجہانی ملکہ کی نیابت شہزادی بیٹرس Beatrice کر رہی تھیں۔

دوسرا الاؤ ۱۹۰۹ میں آگرے میں منشی عبدالکریم کی وفات کے بعد جلا۔ اس کا حکم بھی شاہ ایڈورڈ نے دیا تھا۔ اس وقت وائسرائے لارڈ منٹو نے درخواست کی کہ منشی صاحب کی بیوہ کو ملکہ وکٹوریا کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ خط اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ دے دی گئی۔

تاریخ کو مٹانے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں۔ تاریخ میں یہ تو لکھا جائے گا کہ الاؤ جلا، لیکن یہ کبھی نہ لکھا جا سکے گا کہ اس الاؤ میں کیا کیا جلا۔ ملکہ کے خط جلے، ہم جان گئے، لیکن ان خطوں میں کیا لکھا تھا، کبھی نہ جان پائیں گے۔

وہ منشی جس کے نام پر عیاری، مکاری، چال بازی، خودغرضی اور ذاتی منفعت جیسے ٹھپے لگتے رہیں گے، آخر کار اتنا سادہ نکلا کہ نہ ان کا غذات کی نقلیں کہیں چھوڑیں، نہ غیروں کو دکھاتے پھرے، نہ انہیں کابل کے دربار میں بھیجا اور نہ ہندوستان کے 'شورش پسندوں' کو پڑھوایا جو ان کا استحصال کرتے۔

اس پورے قصے کا انجام ہمیں کہیں ملتا ہے تو لیڈی کرزن کے ایک خط میں ملتا ہے جو انہوں نے ملکہ کے انتقال کے چھ مہینے بعد اپنے شوہر کو لکھا تھا:

"شارلٹ نے مجھے بتایا کہ منشی کا جو ہیولہ قلعہ ونڈسر میں سارے گھرانے کو برسہا برس ڈراتا رہا وہ ایک مضحکہ خیز ڈھکوسلا Farce ثابت ہوا، اور اس بے چارے نے نہ صرف اپنے تمام خط بلکہ وہ فوٹو بھی جن پر ملکہ کے دستخط تھے، ان لوگوں کے حوالے کر دئیے اور پٹے ہوئے جانور کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ -- لارڈ کرومر نے مجھے بتایا کہ جب لارڈ روز بری نے انہیں ہندوستان میں تقرر کی پیش کش کی تو اس بات پر زور دیا کہ تمہیں جو فیصلہ کرنا ہو، جلدی کرو کیونکہ ابھی منشی چھٹی پر ہندوستان گئے ہوئے ہیں، وہ واپس آگئے تو ہر تقرر پر اعتراض کریں گے اور اسے رکوائیں گے۔ یہ بات اب کتنی مضحکہ خیز لگتی ہے۔ لارڈ کرومر نے مزید کہا کہ مشرق کے بارے میں ملکہ کے تمام خیالات دراصل منشی کے خیالات ہوتے ہیں، اسی لئے غلط ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ لارڈ صاحب کو ملکہ کے فیصلوں پر رائے قائم کرنے کا سلیقہ بھی نہ آیا۔"

چار سال بعد پرنس آف ویلز، جو بعد میں جارج پنجم ہوئے، ہندوستان کے دورے پر گئے اور وہاں سے اپنے والد کو یہ خط لکھا:

سرکٹ ہاؤس، آگرہ

۱۷ دسمبر ۱۹۰۵

---- شام کو ہماری ملاقات منشی سے ہوئی۔ وہ پہلے سے زیادہ خوش شکل نہیں ہوئے ہیں اور ان کا موٹاپا بڑھتا جارہا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہم سے ملاقات کے وقت وہ بے انتہا مہذب، با ادب اور نہایت مسرور تھے۔

انہوں نے سینے پر سی-وی-او کا تمغہ لگا رکھا تھا جو مجھے معلوم نہیں ان کو کب ملا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ یہاں خاموشی سے رہتے ہیں اور کوئی مشکل کھڑی نہیں کرتے۔"

مطلب یہ کہ ان کی زندگی کے حالات کی جو کتاب آگ میں جھونک دی گئی تھی، اب اسے دوبارہ نہیں لکھ رہے ہیں۔

آئے گئے کی روٹی

جیسے ملکہ جہاں سے اٹھیں، ویسے ہی منشی بھی ان کی گلی سے اٹھ گئے۔

صاف ظاہر ہے کہ وہ خالی ہاتھ نہیں اٹھے۔ ملکہ نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ ان کے بعد منشی پر کیا گزرے گی۔ وہ بھی سارے ہی بندوبست کر کے گئیں۔ منشی واپس آگرہ پہنچے تو باقی زندگی گزارنے کے لئے خدا کا اور ملکہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زندگی صرف آٹھ برس میں گزر گئی۔

برطانیہ میں تو ان کی کریم کاٹج چھوٹی سی رہی ہوگی۔ آگرے میں انہوں نے اتنی بڑی کریم لاج بنوائی کہ تقسیم ہند کے بعد اسے گرا کر اس کے احاطے کے اندر سڑکیں نکالی گئیں اور اس میں ڈاکٹروں کی کالونی بنی۔ جس سڑک پر کریم لاج تھی اس کا نام باغ فرزانہ روڈ رکھا گیا تھا، باغ فرزانہ اسی سڑک پر اور اس کا قصہ ذرا آگے ہے۔

منشی حافظ عبدالکریم مشکل سے جب تک رہے اور چپ سادھ کر رہے۔ نہ کسی نے ان کی سوانح لکھی نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ انہوں نے بھی جا کر کسی کو نہیں بتایا کہ وہ برطانیہ کے محل میں کیسا طوفان اٹھا کر آئے ہیں۔ کسی نے آج تک نہیں جانا کہ سرزمین برطانیہ میں مسلمانوں کی تحریک کی بنیاد رکھنے والوں میں ان کا نام بھی آتا ہے، اور وہ بھی الزام بن کر۔

لے دے کر ایک مضمون ملتا ہے جو کسی معمولی مصنف نے نہیں بلکہ عظیم بیگ چغتائی جیسے اہل قلم نے لکھا لیکن وہ بھی اپنے وقت کے بچوں کے مقبول رسالے 'پھول' کے لئے۔ اور اس کے بارے میں بھی کہنا مشکل ہے کہ وہ عبدالکریم کے بارے میں ہے یا محمد بخش کے متعلق، یا دونوں ایک مضمون میں مدغم ہو گئے۔

لکھتے ہیں: اگر میں نام نہیں بھولتا تو کریم بخش ہی نام ہے۔ یہ ملکہ وکٹوریا کے خاص اردلی تھے۔

اس کے بعد مرزا صاحب نے ان سے سنے ہوئے حالات لکھے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ملکہ کے بعد وہ بارہ روپے ماہوار کی پنشن پر ہندوستان آئے۔ بے چارے کنبے والے آدمی تھے۔ مجبوراً آٹے دال کی دکان کر لی۔ لڑکا جوان ہوا تو نوکری کی کوشش کی کہ تحصیل میں چپراسی ہو جائے، وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ کیفیت منشی عبدالکریم کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے جارج پنجم سے ان کی ملاقات کا ڈرامائی احوال لکھا ہے کہ آگرے کی سڑک پر انہوں نے شاہ جارج پنجم کے پاؤں پکڑ لئے۔ جارج اپنی تاج پوشی کے دربار کے لئے 1911 کے آخر میں ہندوستان گئے تھے۔ منشی عبدالکریم کو انتقال کئے دو سال گزر چکے تھے۔ ظاہر ہے کے مرزا صاحب کا یہ مضمون محمد بخش کے بارے میں ہے جس نے منشی کے ساتھ ہی ملکہ کی قدم بوسی کی تھی اور منشی کے خلاف ڈاکٹر ریڈ کے کان بھرے تھے۔

ایک اور کتاب کا ذکر سننے میں آتا ہے جس میں منشی صاحب کا احوال درج ہے۔ اس کا نام تزک زریں بتایا جاتا ہے۔ فارسی کی یہ کتاب، جو کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں لکھی گئی، اب کم یاب ہے۔

اس کے بعد آتی ہیں اولادوں میں سینہ بہ سینہ چلنے والی روایتیں اور شہادتیں۔

منشی عبدالکریم کی ایک بہن تھیں جو بی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کے شوہر بھی منشی کے والد وزیرالدین کی طرح ڈاکٹر تھے۔ عبدالکریم کی طرح ان کے ہاں بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بی آگرہ ہی میں پنج کوئیاں کے قبرستان میں اپنے بھائی کے پہلو میں دفن ہیں۔

منشی کے ایک بھائی تھے، منشی حافظ عبدالعزیز۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ تحصیل دار تھے اور آگرہ سمیت مختلف تحصیلوں میں رہ چکے تھے۔ خود منشی نے لکھا کہ وہ شہر کے 'کلکٹر' تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھیں جو بیّن کہلاتی تھیں اور پانچ بیٹے تھے: عبدالرشید، ابوسعید، عبدالحمید، عبدالمجید اور سب سے چھوٹے بیٹے عبدالوحید۔ جب منشی اور ان کی بیوی کا علاج کرا کے ملکہ ہار گئیں اور اولاد ہونے کا امکان نہ رہا تو منشی نے عبدالوحید کو گود لے لیا۔ پیار سے انہیں چھٹو میاں کہا جاتا تھا۔

عبدالوحید کے بیٹے خورشید احمد خاں ہیں اور سندھ کے شہر حیدرآباد میں رئیس میاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی دو بہنیں کراچی میں رہتی ہیں اور ملکہ کا وہ بڑا سا مجسمہ ان ہی کے پاس ہے جس پر سنا ہے کہ سونا چڑھا ہوا ہے۔ آگرے میں اب ان کا عزیز کوئی نہیں البتہ ایک تایازاد بہن بنگلور میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ رئیس میاں بتاتے ہیں کہ ان کی دادی کے کچھ رشتے دار ہندوستان ہی میں رہ گئے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اب کون کہاں ہے۔ ان کی دادی یعنی منشی صاحب کی بیوی، جن کا نام رشیدن بیگم تھا، منشی کی رشتے دار تھیں اور ان کا تعلق آگرے ہی کے مقام دوہرا سے تھا۔ رئیس میاں کہتے ہیں: وہ نسل اب ختم ہوئی۔

جیسے بعض خاندانوں میں ایک آدھ لڑکا خراب نکل جاتا ہے، منشی صاحب کے ایک بھتیجے عبدالحمید کے

بارے میں بھی کچھ ایسی ہی روایت ہے۔ ان کا پیار کا نام بوا تھا لیکن خدا جانے انہیں کیسا پیار ملا تھا جس نے انہیں بگاڑ کر رکھ دیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چوری چکاری کے دھندے میں لگ گئے تھے اور کچھ کا کہنا ہے کہ وہ ڈکیت ہو گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کاروبار میں ان کی بیوی بھی ان کی شریکِ کار ہو گئی تھیں لیکن انہوں نے جلد ہی توبہ کر لی۔ یہ روایت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی راج کے خلاف بغاوت کر دی تھی جسے حکام نے ڈکیتی کا نام دیا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ان کی بیوی اپنے بیٹے سے کہا کرتی تھیں کہ تیری خاطر لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی وجہ ہو گی کہ عبدالحمید بوا نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر ایک ہندو عورت سے شادی کر لی۔ بوا کے والد نے ان کو جائیداد سے تو محروم نہیں کیا البتہ گھر سے نکال دیا اور انہوں نے باقی عمر فتح پور ہسوا میں اپنی زمینداری پر گزاری۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ بوا نے منشی عبدالکریم اور ملکہ وکٹوریا کی کچھ تصویریں سنبھال کر رکھیں۔ ان کے پاس ملکہ کے ہاتھ کا اردو میں لکھا ہوا وہ خط بھی تھا جس میں ملکہ نے منشی کی علالت پر تشویش ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ بس بہت ہوا، اب جلد واپس انگلستان آ جاؤ۔

رئیس میاں کو منشی صاحب کے دو ساتھی یاد ہیں، ایک تو سر رفیع الدین احمد اور دوسرے اپنی چچی کے والد جن کا نام کپتان سید احمد حسین تھا۔ وہ ملکہ وکٹوریا کے باڈی گارڈ تھے۔ ان کا تعلق مشرقی پنجاب کے علاقہ کیتھل سے تھا۔ منشی کے بڑے بھتیجے عبدالرشید بھی انگلستان میں تھے جہاں ان دونوں کی ایک تصویر موجود ہے۔

منشی کے بھائی عبدالعزیز کے ایک پوتے عبدالقادر تھے اور پاکستان کی فضائی فوج سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ کرکٹ کے کھلاڑی بھی تھے۔ کچھ عرصہ ہوا برطانیہ گئے تھے جہاں حکومت نے ان کی پذیرائی کی اور انہیں منشی عبدالکریم کی یادگاریں دکھائی گئیں۔ غالباً ۱۹۹۷ میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔ اس سے پہلے ان کے بچے منشی صاحب کی بچی کھچی نشانیاں دیکھنے آگرہ گئے اور ٹیکسی ڈرائیور سے کریم لاج چلنے کو کہا۔ وہ انہیں سیدھا اس جگہ لے گیا جہاں کبھی کریم لاج تھی اور اب ڈاکٹروں کی کالونی ہے۔ البتہ عمارت کا وہ حصہ کھڑا ہے جس میں تقسیم ہند کے وقت تک ان کے بال بچے رہتے تھے۔ عبدالقادر کے بیٹے، عبدالمتین عرف سرکار کراچی میں اور ان کی بیٹی سلطانہ سید برطانیہ کے شہر ناٹنگھم میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا پورا خاندان پاکستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہر جانب پھیلا ہوا ہے۔

پاکستان کے نامور دانش ور جمیل جالبی بتاتے ہیں کہ ان کی نانی صاحبہ کی منشی سے عزیز داری تھی۔

آیئے اب منشی کے پوتے رئیس میاں کی داستان سنیں۔

اُن تک جو روایت پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ ملکہ وکٹوریا نے اپنے ہندوستانی مہمانوں سے گفتگو کرنے کے لئے

اردو سیکھنے کا فیصلہ کیا اور انہوں نے وائسرائے کو لکھا کہ ہندوستان سے ایک ایسا شخص بھیجا جائے جو اعلیٰ خاندان کا ہو اور ملکہ کا اتالیق بن سکے۔ چنانچہ سنٹرل جیل، آگرہ کے ڈاکٹر وزیر الدین کے بیٹے یعنی منشی عبدالکریم کو چنا گیا جو فارسی، عربی، اردو اور انگریزی جانتے تھے۔ ملکہ کو ان کا نام تجویز کیا گیا۔ آگرے میں انکوائری ہوئی، کلکٹر اور وائسرائے نے اپنی رپورٹ برطانیہ بھیجی اور اس طرح 'انڈین ٹیوٹر' کے منصب پر ان کا تقرر ہوا اور یہ ۱۸۸۷ء میں برطانیہ گئے۔

ملکہ نے ان کے بارے میں جیسا سنا تھا انہیں اس سے بڑھ کر پایا اور ان کو ترقی دی گئی۔ پہلے منشی کو انہوں نے اپنا انڈین سکریٹری مقرر کیا۔ یہ منصب وائسرائے ہند کے برابر تھا۔ جب منشی عبدالکریم ہندوستان آئے ہوئے تھے ان ہی دنوں وہاں شاہی دربار لگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دربار میں منشی کو کس جگہ بٹھایا جائے۔ انہوں نے ملکہ کو تار دیا اور پوچھا کہ وہ دربار میں کس حیثیت سے شریک ہوں۔ وہاں سے راتوں رات جواب آیا کہ دربار میں منشی ملکہ کی نمائندگی کریں گے اور وائسرائے مملکت کے نمائندے ہوں گے چنانچہ دربار میں ان کی کرسیاں برابر ڈالی گئیں (یہ سارے بیانات منشی کے پوتے، رئیس میاں کے ہیں)۔

رئیس میاں بتاتے ہیں کہ جب ملکہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے وصیت میں منشی کے لئے پانچ سو پاؤنڈ یا شاید پانچ ہزار پاؤنڈ کی رقم چھوڑی۔ بعد میں لندن سے ملکہ کے وکیل کا خط آیا جس میں منشی صاحب سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کو یہ رقم کیسے ادا کی جائے۔ اس باب کے آخر میں اسی بات کا ذرا سا مگر لطیف سا اشارہ ہے۔

رئیس میاں بتاتے ہیں کہ خاندان میں ملکہ وکٹوریا کا ایک فرمان بھی موجود تھا جس میں ملکہ نے لکھا تھا کہ میرے بعد میری اولادیں منشی عبدالکریم اور ان کی اولادوں کا خاص خیال رکھیں گی۔ فرمان کی وہ دستاویز تقسیم ہند کے بعد سے غائب ہے۔ اسی طرح وکٹوریا کا وہ خط بھی لاپتہ ہے جو ملکہ نے ایک تاریخی تلوار کے ساتھ منشی کو دیا تھا۔ وہ تلوار حیدرآباد میں موجود ہے اور اس کے بارے میں ایک روایت یہ کہ وہ شہنشاہ اکبر کی تلوار تھی اور برطانیہ کے ایک عجائب گھر میں رکھی تھی۔ وہ تلوار منشی صاحب کو پسند آگئی اور انہوں نے ملکہ سے فرمائش کر کے حاصل کر لی۔

رئیس میاں نے تلوار اپنے کچھ جرمن دوستوں کو دکھائی جنہیں قدیم اسلحہ کا علم ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تلوار اکبر کے عہد کی تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں کہ یہ خود بادشاہ کی تلوار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دو دھاتوں کی یہ تلوار بہت تیز آنچ پر پکا کر یکجان کی جاتی تھی اور چار سو سال پہلے تک بنا کرتی تھی۔ اس کا پھل، جس پر ابر ہوا کرتے تھے، دمشق کے نام سے منسوب ہوا کرتا تھا۔ اس کی نیام چمڑے کی ہے جس پر کبھی سونے کا کام رہا ہوگا۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے۔

یہ تلوار کسی موقع پر چلائی بھی گئی ہے کیونکہ اس کی دھار جا بجا کسی دوسری دھار سے ٹکرائی ہے جس کے نشان

موجود ہیں۔ ملکہ نے تلوار تحفے کے طور پر منشی کو پیش کی اور اس کے ساتھ ایک خط بھی دیا جو کہیں کھو گیا ہے۔

پرانی تصویروں میں منشی یہی تلوار باندھے نظر آتے ہیں۔

رئیس میاں کو ان کی دادی یہ ساری باتیں بتاتی تھیں۔ ان ہی نے بتایا کہ منشی صاحب کے پاس ملکہ کے بہت سے احکامات اور ایسے کاغذات تھے جن کا تعلق سرکاری پالیسیوں سے تھا اس کے علاوہ بہت سے دوسرے خفیہ کاغذات تھے جن کا علم صرف ملکہ اور منشی کو تھا۔ وہ سب کے سب جلا دیئے گئے۔

برطانیہ میں اور ہندستان میں بھی، انہوں نے سامنے آ کر نہیں تو چلمن کی اوٹ سے دونوں الاؤ جلتے دیکھے ہوں گے۔ برطانیہ میں کم سے کم ان کے ساتھ آنسو بہانے والا ایک شخص موجود تھا۔

رئیس میاں بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا ان کی دادی ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھیں۔ بے حد صاحب کردار خاتون تھیں۔ گھر کے سارے امور ان کے ہاتھ میں تھے۔ سودا سلف، نوکر ملازم، سب پر ان کی نگرانی تھی۔ اس وقت گھر میں کم سے کم دس ملازم تھے۔

گھر کا ایک نوکر منوا تھا۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں: منوا، آئے گئے کی روٹی رکھ دی ہے؟ مطلب یہ کہ کوئی تاخیر سے آئے تو اس کے لئے کھانا تیار ہو۔ اکثر زمینوں سے کاشتکار آ جاتے تھے، تو کھانا دستیاب ہوتا تھا۔

رئیس میاں بتاتے ہیں کہ منشی صاحب آسودہ حال تھے۔ ان کی اور ان کے والد کی زمینداری تھی، جائیداد تھی اور آگرے کی سول لائنز میں بنگلے تھے۔ پندرہ بیس ہزار ایکڑ زمین تھی جو بعد میں ان کے بھائی، بہن اور بیوی میں تقسیم ہوئی۔ اپنے بیٹے، یعنی رئیس میاں کے والد کے نام انہوں نے پانچ ہزار ایکڑ زمین اور تین چار بنگلے چھوڑے۔ اہل خاندان بتاتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے بعد عرصے تک املاک کے بٹوارے کا قضیہ چلا اور جائیداد کا ایک حصہ کسٹوڈین کے پاس چلا گیا۔

منشی صاحب نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ یتیم خانے قائم کیے جنہیں وہ اپنی نگرانی میں چلاتے تھے۔ ان کے کاغذات موجود تھے، ڈھونڈیں تو شاید مل جائیں۔ انہوں نے آگرے کا باغ فرزانہ بھی خریدا تھا جس کی قلعے جیسی دیواریں تھیں، بُرج تھے اور وسط میں شان دار عمارت تھی۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۹۶ء میں ملکہ کی ڈائمنڈ جوبلی کا جشن اسی باغ فرزانہ میں ہوا تھا جس کا اہتمام منشی کے بھائی عبدالعزیز نے کیا تھا جو بااختیار حاکم تھے۔ اس باغ کا قصہ بھی دل چسپ ہے۔ سنا ہے کہ آگرے کے ایک ہندو رئیس کی ایک مسلمان داشتہ تھی جس کا نام فرزانہ تھا۔ وہ مر گئی تو رئیس نے اس کی یادگار کے طور پر ایک خوب صورت باغ کے اندر فرزانہ کی قبر اور ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس مقام کا نام باغ فرزانہ رکھا۔ اسی کی نسبت سے کریم لاج کی سڑک کا نام اب تک باغ فرزانہ روڈ ہے۔

آگرے والوں کی اس قسم کی یادگاریں بنوانے کا فن خوب آتا تھا۔

رئیس میاں کی دادی بتاتی تھیں کہ منشی صاحب باقاعدگی سے اپنی زمینوں پر جایا کرتے تھے۔ شان دار فٹن میں بیٹھ کر وہ اپنے علاقے دیکھنے جاتے تھے۔ ساتھ میں ملازموں کی ایک فوج چلا کرتی تھی۔ ملکہ اگر انہیں نواب کا خطاب دے دیتیں تو یقین ہے کہ ان پر بجتا۔

ان کی زندگی میں اور پھر ان کے بیٹے کے ہوتے ہوئے، بڑے بڑے حکام، راجا مہاراجا اور سب سے بڑھ کر شاہی گھرانے کے لوگ شکار کھیلنے ان کے ہاں آتے تھے اور ان کی زمینوں پر جاتے تھے۔ رئیس میاں کہتے ہیں کہ انہیں اُس وقت کی شہزادی الزبتھ کے شوہر شہزادہ فلپ کا آنا یاد ہے، جنہیں انہوں نے بھرت پور میں دیکھا تھا۔

وہ بتاتے ہیں کہ شاہی خاندان نے ملکہ کے فرمان کے مطابق منشی کے بعد ان کے بیٹے کا خیال رکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد کسی اعلیٰ حاکم نے، غالباً خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے منشی کے بیٹے عبدالوحید کو پیش کش کی کہ ان کی زمینوں کے بدلے انہیں آسٹریلیا میں اراضی دلائی جا سکتی ہے، اگر وہ ہندوستان میں رہنا پسند نہ کریں تو آسٹریلیا چلے جائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، اب پاکستان ہمارا وطن ہے اور ہم پاکستان جا رہے ہیں۔

اس کے بعد وہ اپنی ماں، یعنی منشی کی بیوی اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر پاکستان چلے گئے۔

اس دوران بہت سے اہم کاغذات ضائع ہو گئے۔

منشی کے بھائی، اور رئیس میاں کے اصل دادا، حافظ عبدالعزیز ۱۹۳۵ء میں آگرے ہی میں چل بسے۔ اگلے روز ان کی بیوی بھی گزر گئیں۔

رئیس میاں کے والد ۸۴ء تک زندہ تھے۔ منشی کی بیوی کو آخر عمر تک برطانیہ کی طرف سے پنشن ملتی رہی۔

منشی عبدالکریم کے بارے میں رئیس میاں کا کہنا ہے کہ رنگون میں آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کا مزار بھی ان کے اصرار پر اور ملکہ وکٹوریا کے حکم سے بنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت کے حکام کا یہ حکم تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی قبر پر کوئی عمارت نہیں بن سکتی۔ لیکن جب منشی صاحب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ملکہ سے بات کی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ ملکہ نے جھٹ ان سے اتفاق کیا ہوگا اور مزار کی تعمیر کا حکم جاری کیا ہوگا۔

خود منشی حافظ عبدالکریم آگرے میں پنج کوئیاں کے قبرستان میں دفن ہیں جہاں ان کے اہل خاندان کے لئے الگ احاطہ مخصوص تھا۔ منشی صاحب کی قبر پر گنبد بھی تھا۔ اب خبر نہیں کہ ہے یا ڈھے گیا، ان کی داستانِ حیات کی طرح۔

رئیس میاں کے پاس جو سوغاتیں بچی ہیں ان میں کچھ خط بھی ہیں۔ یہاں منشی کے نام ضعیفی کے عالم میں کانپتے ہاتھوں سے لکھے گئے ملکہ کے ایک چھوٹے سے خط کی نقل ہے۔ خط کیا ہے، ایک تعلق اور ایک قرب کی تصویر ہے:

اوسبورن

۱۲ فروری ۱۸۹۸

میں نے اپنی وصیت کے بندوبست میں تمہارے آرام کا انتظام کردیا ہے اور ہر لمحہ مجھے تمہاری بھلائی کا خیال رہا ہے۔

اس پرچے کے ساتھ میں جو طویل خط منسلک کررہی ہوں وہ تقریباً ایک مہینے پہلے لکھا گیا تھا اور وہ مکمل طور پر اور تمام تر میری اپنی رائے ہے۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اور اس کے جواب میں جو کچھ تم لکھو گے، اس کا علم کسی دوسرے انسان کو کبھی، کسی صورت میں نہیں ہوگا۔ اگر تم اسے پڑھ نہ پاؤ تو میں تمہاری مدد کردوں گی، اس کے فوراً بعد اسے جلا دینا۔

تمہاری وفا شعار سچی دوست

وکٹوریا

وہ طویل خط اور اس کا جواب اب کہیں نہیں ملتا۔ اور ملے بھی کیوں؟

دونوں وفا شعار اور سچے دوست جو ٹھہرے۔

پردہ گرتا ہے

تو یہ ہے اس کہانی کا انجام۔

بہت پیارے شوہر البرٹ اور بے حد عزیز ملازم جان براؤن کے مرنے کے بعد جب ملکہ وکٹوریا کی زندگی پر ہو کا عالم طاری تھا، ایسے میں آگرے سے ایک چوبیس برس کا خوب رو نوجوان آیا اور خدمت کرتے کرتے ملکہ کے دل میں البرٹ اور براؤن جیسی چاہت جگا دی۔

یہ آگرہ جیل کے ایک دیسی ڈاکٹر کا بیٹا عبدالکریم تھا جو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پڑھتا ہوا اور قران حفظ کرتا ہوا ہندوستان سے آیا اور ملکہ نے اس سے کہا کہ ہندوستانی بول کر دکھاؤ۔ وہی لفظ ملکہ نے دوہرائے اور خود اپنی آواز سن کر اتنی خوش ہوئیں کہ اگلے ہی لمحے عبدالکریم، منشی عبدالکریم ہو گئے۔ ہر چند کہ ملکہ کی بینائی ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی لیکن جب منشی نے ہاتھ پکڑ کر ان سے اردو لکھوائی تو جھروکوں سے جھانکنے والوں نے ایسے افسانے تراشے کہ لگتا تھا شاہی محل میں کوئی انسان نہیں، بھوت پریت چلا آیا ہے۔

ادھر ملکہ نے اپنی آنکھوں کے جھروکوں سے ہندوستان کے ایسے سہانے خواب دیکھنے شروع کیے کہ جن میں کہیں پگڑیاں باندھے توانا مرد تھے تو کہیں ساریوں میں لپٹی لپٹائی شرمیلی عورتیں۔ کہیں مسجدوں سے بلند ہوتی اذان تھی اور کہیں چنگھاڑتے ہاتھیوں کا شور۔ حالت یہ ہوئی کہ ملکہ نے اپنے در و دیوار ہندوستان سے آئی ہوئی سوغاتوں اور اپنا تن بدن راجوں مہاراجوں کے بھیجے ہوئے زیورات سے سجا لیا۔

اس دوران آگرے کا وہ نوجوان برطانیہ کا جنٹل مین بن گیا، محل اور دربار کی اونچی نشستوں پر بیٹھنے اور شاہی سواریوں میں سفر کرتے کرتے وہ ان تمام لوگوں کے آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا جن کی آنکھوں کی رنگت اس کی آنکھوں کی رنگت سے جدا تھی۔

وہ تو تین تین دن انتظار کرتے تھے اور ملکہ سے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوتی تھی اور یہ کہ گھنٹوں ملکہ کے خلوت خانے میں راز و نیاز کیا کرتا تھا اور کبھی اپنا منصب بڑھانے کی فرمائشیں کیا کرتا تھا اور کبھی ترچھی نظروں

سے دیکھنے والوں کی شکایتوں کے طومار باندھا کرتا تھا اور اگلی ہی صبح ان کے نام ملکہ کا خط آتا تھا کہ خبردار۔

البرٹ اب تک ملکہ کے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ میں اب بھی البرٹ کی چھوٹی سی تصویر تھی۔ ملکہ جب کوئی خوش نما منظر دیکھتی، اس تصویر کو بلند کر کے اسے بھی دکھاتی۔ ملکہ کی چاہت کے انداز سب سے جدا تھے اسی لئے کوئی نہ انہیں سمجھ پایا نہ ان کی محبت کو، اور ایک مرحلے پر ملکہ کو پاگل قرار دیئے جانے کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کے خاندان میں دیوانگی کے جراثیم تھے لیکن یہ فیصلہ کون کرتا کہ ان کی کون سی بات پاگل پن کی حدود کے اندر ہے اور کون سی باہر۔

اپنے چہیتے منشی کی خاطر ملکہ نہ جانے کس کس سے لڑی، کس کس کا منہ نوچا، کتنی ہی بار آٹھ آٹھ آنسو روئی اور کتنی ہی مرتبہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ بخار اترا کہ نہیں۔

محل کی زندگی سپاٹ سی ہو چلی تھی۔ بس کبھی کبھار ملازمائیں گاتیں اور ملکہ بیٹھی مسکراتیں، پھر سوانگ رچائے جانے لگے۔ اسٹیج سجنے لگے اور سارا شاہی خاندان اور تمام ملازم اداکاری کرنے لگے۔ جہاں کہیں رنگ دار اور ڈاڑھی والے اداکاروں کی ضرورت ہوتی، ہندوستانی ملازم یہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے۔ منشی عبدالکریم بھی سوانگ رچاتے اور ملکہ دل ہی دل میں داد دیا کرتیں۔

جس کو بھی موقع ملتا وہ ملکہ کے کان میں یہ بات ضرور پھونکتا کہ منشی اسٹیج ہی کا نہیں سچ مچ کا بہروپیا ہے، آپ کو خبر نہیں کہ آپ نے آستین میں کیسا سانپ پال رکھا ہے۔ کچھ تو ملکہ کی سماعت میں نقل آچلا تھا، کچھ انہوں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینے کا گر سیکھ لیا تھا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

منشی پر الزام لگا کہ وہ ہندوستان کے شورش پسندوں سے جا ملا ہے، وہ مسلم لیگ بنا رہا ہے، اس کے دوست تاج برطانیہ کے راز کابل کے دربار کو بھیج رہے ہیں، وہ سوزاک اور جریان جیسے مرض میں مبتلا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مورخ لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۷ء میں ملکہ نے اپنے مشیروں کی بات پر دھیان دینا شروع کیا۔ مورخوں کو خبر بھی نہیں کہ اس سن میں ملکہ منشی کو لکھ رہی تھیں کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں تمہاری فلاح کا بڑا خیال رکھا ہے۔

کس کو پتہ تھا کہ ملکہ اتنی عمر پائیں گی۔ ولی عہد شہزادے خود بوڑھے ہوئے جا رہے تھے اور ملکہ تھیں کہ جیے جا رہی تھیں۔ مئی ۱۸۹۷ میں ان کی ۷۸ ویں سال گرہ ہوئی تو بولیں کہ میں کافی جی لی، لیکن دعا کرتی ہوں کہ اپنے ملک اور اپنے پیاروں کی خاطر مجھے تھوڑی سی مہلت اور مل جائے۔

وہ خوب ملی۔ ان کے ذاتی طبیب اور منشی عبدالکریم کے ذاتی دشمن ڈاکٹر ریڈ کے سپرد یہ کام تھا کہ ملکہ کی

سانس اور نبض پر نگاہ رکھیں۔ انہیں اُور ساڑھے تین سال انتظار کرنا پڑا۔ اب کہیں ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء کی صبح انہوں نے یقین کے ساتھ دیکھا کہ ملکہ کے چہرے پر فالج کا اثر ہے۔ ولی عہد شہزادہ اس انتظار میں ساٹھ برس کا ہو گیا تھا کہ ملکہ کی آنکھ بند ہو تو اس کے چاہنے والوں کے مجسمے پھوڑے اور کاغذ نذرِ آتش کرے۔

ملکہ پر غشی کا عالم تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ وقت رخصت ہے لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ ابھی جانے کو تیار نہیں۔ پہلی بار کسی نے ان کے جذبات کا خیال کیا اور منشی حافظ عبدالکریم ان کے کمرے میں لائے گئے۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی تھیں اور زندگی کے ٹمٹماتے دیئے سے لڑے جا رہی تھیں۔ منشی نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ہو نہ ہو، وہ زیرِ لب کچھ ضرور پڑھ رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر ریڈ نے اپنے روزنامچے میں لکھا: یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی نہیں مریں گی۔ وہ جینے کی خاطر جدوجہد کئے جا رہی ہیں اور میں ان اس کوشش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اب حالت یہ تھی کہ وہ ڈوبتی تھیں، ابھرتی تھیں، ڈوبتی تھیں، ابھرتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی جان کس میں اٹکی ہوئی تھی۔

۲۲ جنوری کی شام ساڑھے چھ بجے آرچ بشپ نے دیکھا کہ ملکہ کے چہرے پر اچانک سکون سا پھیل گیا اور سر ڈھلک گیا۔ ان کے ولی عہد جارج ہفتم نے فوراً ہی بادشاہت سنبھال لی اور ماں کی میت کو تدفین کے لئے تیار کرنے کا کام ریڈ کے سپرد کیا۔

ملکہ ریڈ کو بہت عرصے سے بتا رہی تھیں کہ ان کے ساتھ ان کے تابوت میں کیا کیا رکھا جائے۔ چنانچہ کچھ تصویریں، کچھ مجسمے، کچھ لباس اور کچھ جواہرات رکھ کر ان کے اوپر ملکہ کی میت لٹائی گئی۔ ان کے چہرے پر جالی کی وہ نقاب ڈالی گئی جو انہیں دلہن بناتے ہوئے ڈالی گئی تھی اور ان کے ہاتھ میں مہکتا ہوا گل دستہ تھمایا گیا۔ بس، ملکہ ڈاکٹر ریڈ کو بس اتنی ہی وصیت کر سکیں۔

شاہ جارج خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ماں کے دل میں منشی کو کیا مقام حاصل تھا۔ لہٰذا منشی عبدالکریم کو موقع دیا گیا کہ جا کر ملکہ کو الوداع کہیں۔ وہ ان کے کمرے میں لے جائے گئے، اسی اوسبورن کے کمرے میں جہاں سے ملکہ نے انہیں لکھا تھا کہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارا خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے ملکہ کی میت دیکھی جس نے اپنے دلہناپے کی نقاب اوڑھ رکھی تھی اور جس کے اندر وہ بند آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں جنہوں نے کبھی منشی کی آنکھوں کے اندر تک دیکھا تھا۔

پھر جب ملکہ وکٹوریا، قیصر ہند کا جنازہ اٹھا اور دنیا بھر کے فرماں روا، سفرا، روسا اور امرا اس کے ساتھ چلے تو ان لوگوں کے درمیان منشی عبدالکریم کو بھی جگہ دی گئی۔

وہ جہاں تک ساتھ چل سکتے تھے، چلے۔ مگر زیادہ نہیں چل سکے۔ شاید دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔

شاہی گاڑی پر تابوت رکھا تھا۔ اس کے اندر ایک سپاہی کی نڈر بیٹی اور ایک مملکت کی پرعزم ملکہ لیٹی تھی۔ تابوت بند کرنے سے پہلے ڈاکٹر ریڈ نے چپکے سے ملکہ کی ایک مٹھی میں جان براؤن کی ایک چھوٹی سے تصویر رکھ کر مٹھی بند کر دی۔

اور دوسری مٹھی خالی چھوڑ دی۔



ملکہ اور منشی کی ۱۸۹۵ء کی تاریخی تصویر جس کے ساتھ منشی نے یہ تحریر شائع کرادی تھی کہ اس میں وہ ملکہ کو اُردو پڑھا رہے ہیں۔
اس اشاعت کے خلاف بہت شور بلند ہوا تھا۔



بالمورل میں شاہی محل کے قریب منشی عبدالکریم کی قیام گاہ جسے کریم کاٹیج کہا جانے لگا تھا۔



قصرِ ونڈسر میں شاہی خاندان کھانے میں مصروف ہے اور کھانا کھلانے کے لئے ہندوستانی خدمت گار موجود ہیں۔



منشی حافظ عبدالکریم اپنے شاہی اعزازات کے تمغوں کے ساتھ (۱۸۹۵ء)۔



منشی عبدالکریم اور ان کے ایک بھتیجے عبدالرشید۔ یہ تصویر ۱۸۹۷ء کی ہے۔ اس وقت تک منشی فربہ ہو چکے تھے۔



ملکہ وکٹوریہ کے نواسے نواسیاں ایک ہندوستانی خدمت گار عبداللہ کے ساتھ۔



ملکہ کے لئے ہندوستان کے بارے میں ایک ڈرامہ کیا گیا۔ اس تصویر میں اس کے کردار ہیں، جن میں عبدالحسین، عبدالکریم اور خیرات علی کے علاوہ شاہی خاندان کی خواتین شامل ہیں۔



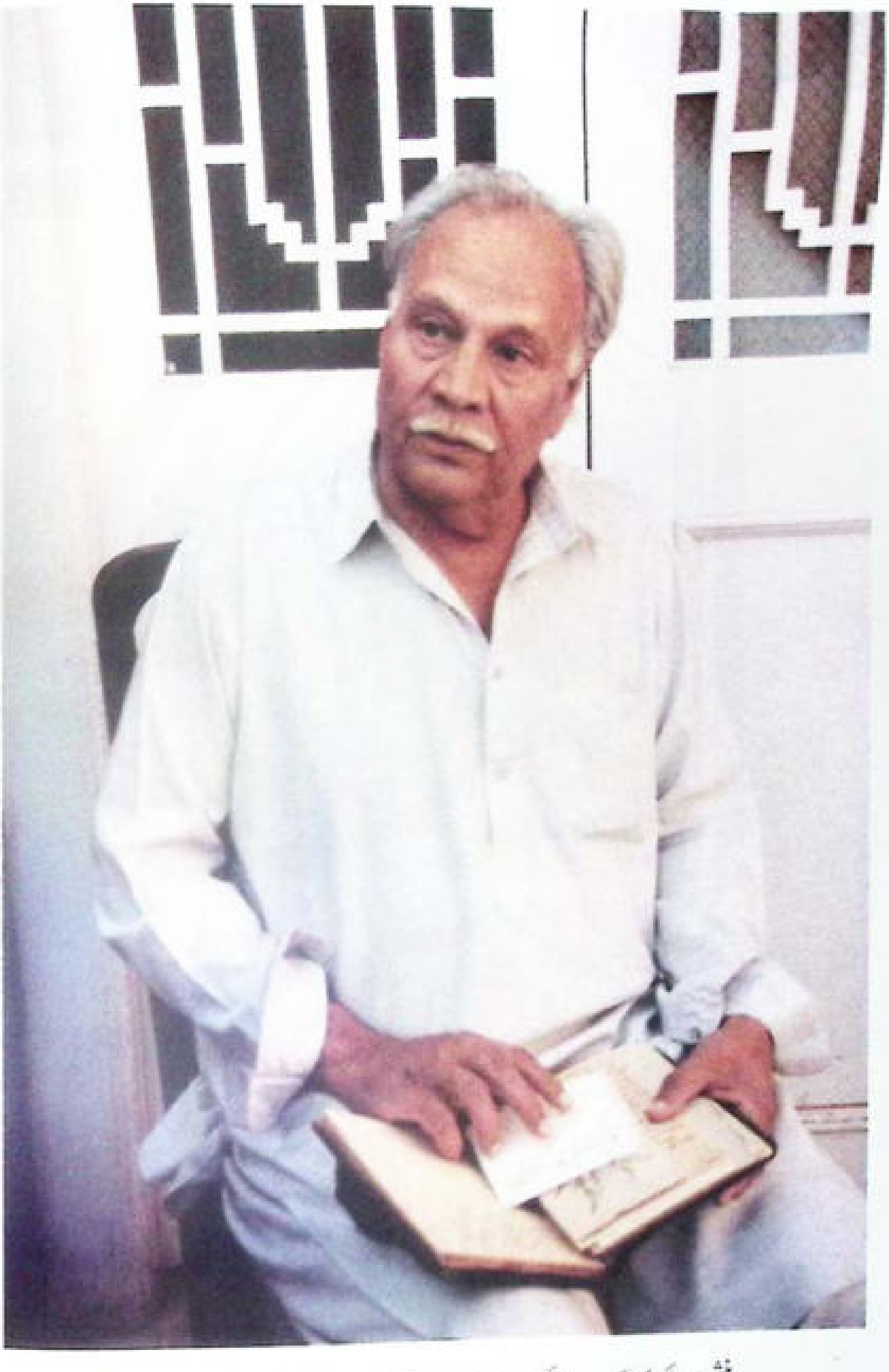
ملکہ وکٹوریہ اور ان کے دو خدمت گار مصطفیٰ اور شیخ چڈا (۱۸۹۶ء)۔



خورشید احمد خاں عرف رئیس میاں حیدرآباد سندھ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ۔ گود لیے ہوئے بیٹے کی نسبت سے رئیس میاں،
منشی عبدالکریم کے پوتے ہیں۔



ملکہ کی عطا کی ہوئی وہ تلوار جسے لگا کر منشی عبدالکریم دربار اور شاہی تقریبات میں جاتے تھے۔



منشی عبدالکریم کے پوتے رئیس میاں جن کے ہاتھ میں دادا کے یادگار کاغذات ہیں۔



منشی عبدالکریم کے البم کا ورق جس پر ملکہ وکٹوریہ اور خود منشی کی ایک یادگار تصویر چسپاں ہے۔ دوسری تصویریں شاہی خاندان کی ہیں۔



کچھ تحفے، تصویریں اور شمع دان جو ملکہ وکٹوریہ نے منشی عبدالکریم کو دیئے تھے۔



منشی حافظ عبدالکریم کی تصویر ان کی اپنی تحریر کے ساتھ۔ اس پر ۲۶ جون ۱۸۹۱ء کی تاریخ درج ہے۔







محل میں رچایا جانے والا ڈرامہ ربیکا جس میں غشی نے مرکزی کردار ادا کیا اور احمد حسین اور محمد بخش نے اُن کا ساتھ دیا (۱۸۸۸ء)۔



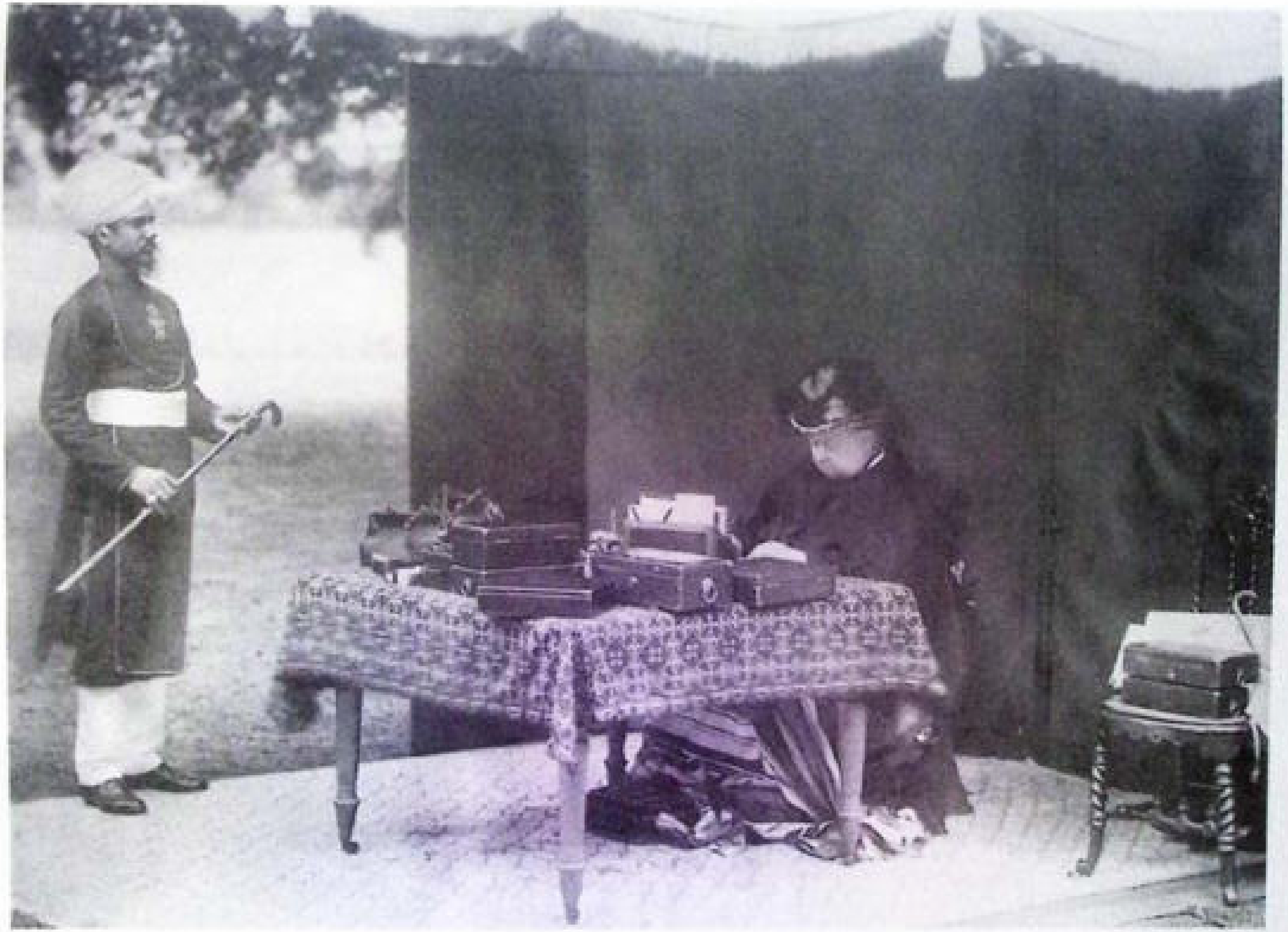
ملکہ وکٹوریہ کے محل میں ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، جس میں اُن کے ہندوستانی ملازموں نے بھی حصہ لیا۔



ملکہ کے ذاتی معالج ڈاکٹر جیمز ریڈ۔ یہ تصویر ۱۸۸۳ء کی ہے۔



دربار میں پیش کیا جانے والا ایک ڈرامہ جس میں منشی عبدالکریم اور محمد بخش نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔



فروگمور ہاؤس میں ملکہ اپنے شاہی کاغذات دیکھ رہی ہیں۔ شیخ چڑ اخدمت میں حاضر ہیں (۱۸۹۳ء)۔



شاہی مصور انجیلی کے ہاتھوں بنی ہوئی منشی عبدالکریم کی شبیہ جس پر ۱۸۹۰ء درج ہے۔



ملکہ کو متاثر کرنے والے اور انگلستان میں مسلمانوں کی پہلی جماعت قائم کرنے والے بیرسٹر رفیع الدین احمد جن کی یہ تصویر
شاہی مصور نے بنائی تھی۔



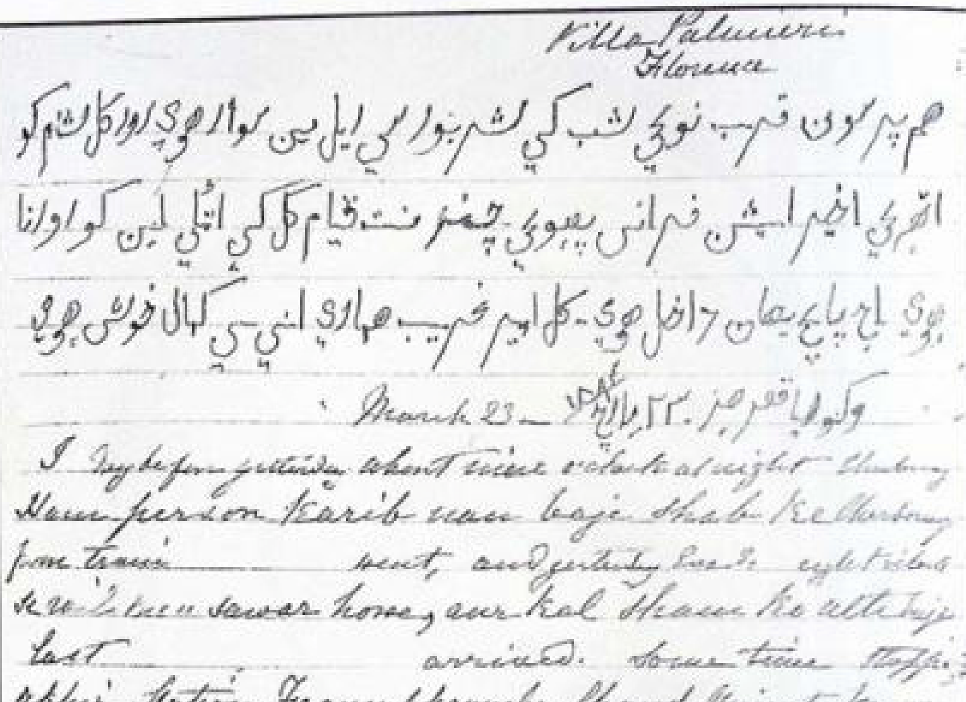
منشی حافظ عبدالکریم کی تصویر پر اُن کے انگریزی دستخط (۱۸۹۲ء)۔



ملکہ وکٹوریہ کے قریبی خدمت گار محمد بخش جو منشی کی آمد سے پہلے شاہی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔



شاہی خاندان ناشتہ کر رہا ہے اور عبدالکریم اور محمد بخش بیرے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔
بعد میں منشی نے دعویٰ کیا کہ وہ اول دن سے ملکہ کے اتالیق تھے۔


Villa Palmieri
Florence

March 23

Ham person Karib nau baje shab ke Cherbourg

kal sham ko

akhri station France pahunche. Chand minute

Italy rail ko rawana hoe. ... yahan dakhil hoe. Kul amir gharib hamare ane se kamal khush hoe.

The day before yesterday I left Cherbourg about nine o'clock in the evening by train, and at eight o'clock in the [illegible] yesterday reached the last station in France. After an hour's stoppage went by the Italian line & arrived here today at 5 o'clock. All classes of the population were very glad at my coming here again.

ملک کے اردو روزنامچے کا ایک ورق۔



عبدالکریم نے خدمت گاروں کا لباس اُتار پھینکا اور وہ لباس پہنا جسے ۱۸۸۸ء کے جنٹل مین پہنا کرتے تھے۔

Oct. 11. 1894

Balmoral Castle.

Dear Abdul,

Your s[illegible] coming back tomorrow [illegible] again in the afternoons but you must not forget that I shall bring the Pr. of Wales at ½ p. 3 or ¼ to 4.

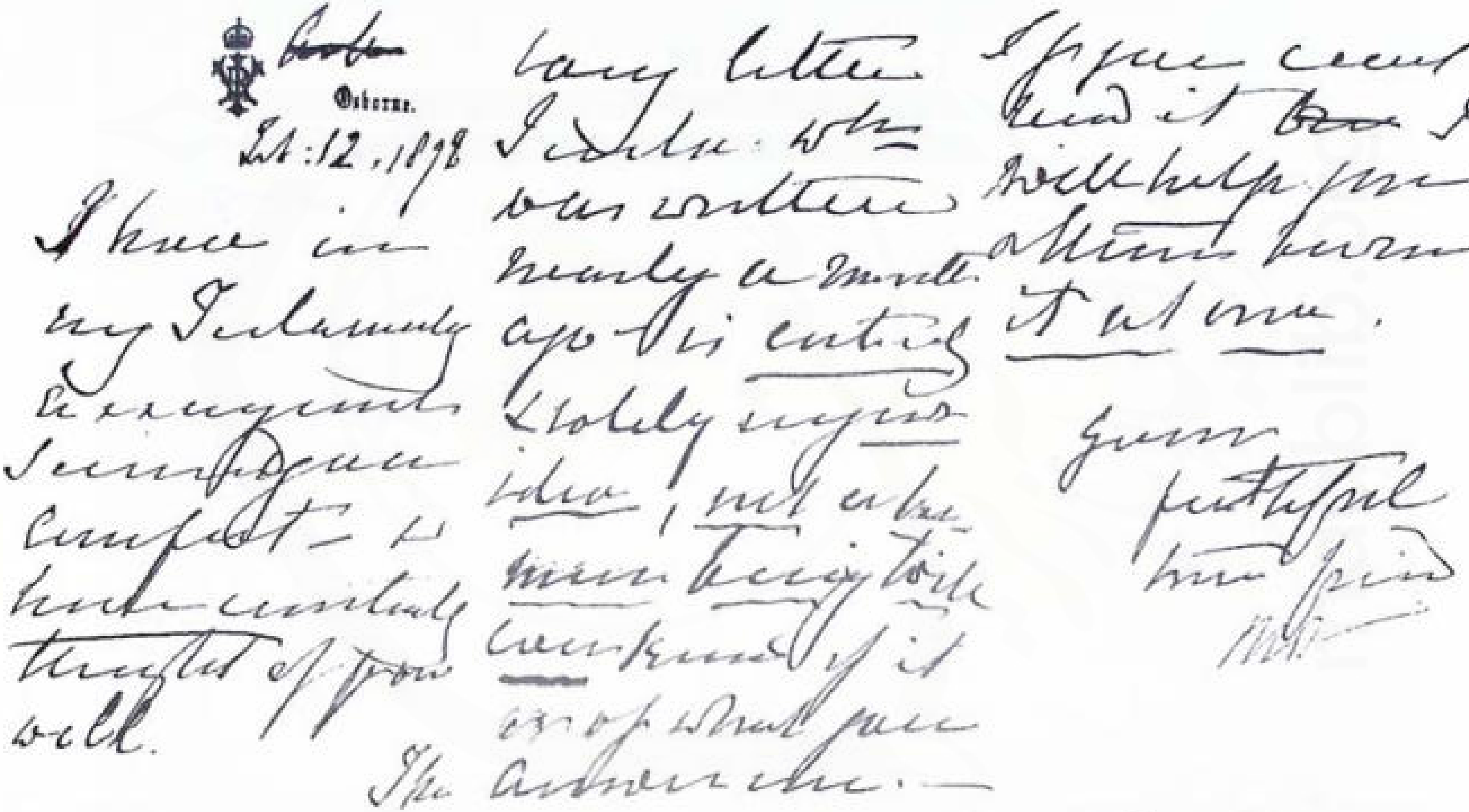
I hear your wife & your aunt [illegible] be there. —

Mr. Beyer told me how pleased he was with his Talk with you. —

Ever your truly devoted & loving Mother

Thursday night
Oct: 11/94

منشی کے نام ملکہ کا وہ خط جس کے خاتمہ پر انہوں نے لکھا: ''فقط تمہاری چاہنے والی ماں''۔ مورخہ ۱۱-اکتوبر ۱۸۹۴ء



Osborne.

Feb: 12, 1898

I have in my Testamentary arrangements secured your comfort & have carefully thought of your well [illegible] every little detail: the ones written nearly a month ago & is entirely & solely my own idea, not a human being knows of it or of what passes. The [illegible] else.— If you ever need it I will help you & [illegible] it at once.

Your faithful true friend

VRI

۱۲۔فروری ۱۸۹۸ء کا وہ خط جس میں ملکہ نے منشی کو لکھا کہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارے لئے معقول بندوبست کر دیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے: پُرخلوص سچی دوست۔ وکٹوریا۔

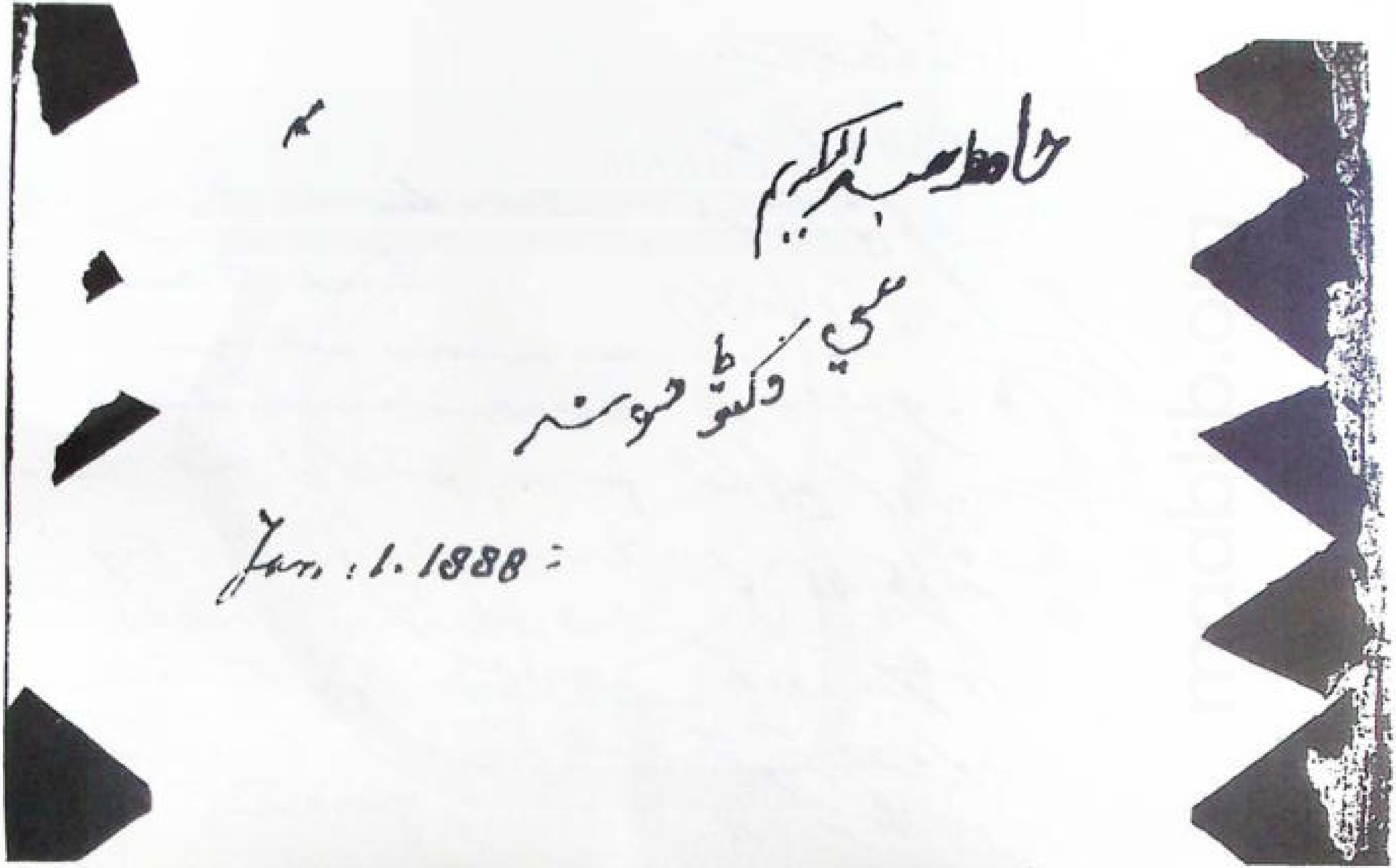
وقت جلدی کا تھا اسلئے میں خود دار برزن
خط نہ لکھ سکا اور ساتھ ہی دیا۔ انہیں بھیجا کریں
امید تو نہ تھی کہ آپ اسقدر جلد نسخہ
کا استعمال کریں۔ کیا اس ہفتہ میں آنے
آپکے ضرور ہو۔ [illegible] جہانتک کوشش
ممکن ہے سمجھا گیا ہوں اور اب جز تعجب ہو
کل 46 پاؤنڈ کو کہہ دیئے۔ جمعہ
کے روز دو بجے 25 پاؤنڈ ضرور جاہو
کیونکہ وعدہ ہو چکا ہے تاکید سمجھے
اس ناچیز کا دوبارہ شکریہ کرتا ہوں

Dear Sir

I wish to have an interview with you regarding new spectacles for my father. I shall give you a call on Friday next at about 3 o'clock and I hope that the time will suit your convenience

Yours truly
[illegible]

منشی عبدالکریم کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دو خطوں کا عکس۔ یہ اندازہ نہیں کہ یہ خط انہوں نے کس کے نام لکھے تھے۔



ملکہ نے منشی کے نام کارڈ بھیجا جس کی عبارت انہوں نے اردو میں رقم کی۔ سال نو کا یہ کارڈ یکم جنوری ۱۸۸۸ء کو لکھا گیا تھا۔

تاریخ / سوانح

تاریخ ہندوستان (مکمل سیٹ دس جلد)	مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی
تاریخ پاکستان (قدیم عہد)	یحییٰ امجد
تاریخ پاکستان (وسطی دور)	یحییٰ امجد
ارضِ پاکستان کی تاریخ	رشید اختر ندوی
شمالی پاکستان	رشید اختر ندوی
پاکستان 14 اگست 1947ء، 14 اگست 2000ء	رضی الدین رضی / شاکر حسین شاکر
انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان	اسد سلیم شیخ
پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں	ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی
قیامِ پاکستان ([illegible] پس منظر)	سمیع اللہ قریشی
منظرِ پاکستان	محمد حنیف شاہد
رودادِ چمن	پیر علی محمد راشدی
پاکستان منزل بہ منزل (۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء)	محمد علی چراغ
تاریخ پاکستان (جولائی 2001ء)	محمد علی چراغ
اکابرینِ تحریک پاکستان	محمد علی چراغ
مطالعہ پاکستان	محمد علی چراغ
قراردادِ پاکستان	محمد علی چراغ
ہمایوں نامہ	ترجمہ: رشید اختر ندوی
تزکِ جہانگیری	ترجمہ: رشید اختر ندوی
تزکِ تیموری	ابوہاشم ندوی
دربارِ اکبری	مولانا محمد حسین آزاد
آئینِ اکبری (اول، دوم، سوم)	علامہ ابوالفضل
شاہجہان نامہ	محمد صالح کمبوہ / ممتاز لیاقت
تاریخ بیت المقدس	ممتاز لیاقت
تاریخ جمہوریت	شاہد حسین رزاقی
تاریخ پنجاب (مع حالات شہر لاہور)	سید محمد لطیف
تاریخ لاہور	کنہیا لال
ایوب خان (فوجی راج کے پہلے دس سال)	الطاف گوہر
تاریخ افغانستان	پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی
تاریخ کشمیر (مسلم عہد)	ڈاکٹر صابر آفاقی
تاریخ بلوچستان	رائے بہادر ہتورام

Rs. [redacted]

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1596-X